قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا ستترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مئی 2020ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿41﴾ (30:41)

لیکن جب لوگوں نے غیر خدائی نظریات وتصورات کو قانون خداوندی کا ہمسر بنا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ یہ ناہمواریاں خود لوگوں کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ ان کی خود پیدا کردہ ناہمواریوں کے بعض تباہ کن نتائج ان کے سامنے آ چکے ہیں۔ اگر یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو یہی نتائج، اس امر کے لئے کافی محرک ہو سکتے ہیں کہ یہ اپنے خود ساختہ نظامِ زندگی سے منہ موڑ کر نظامِ خداوندی کی طرف رجوع کر لیں۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)



طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

مئی 2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 05

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: روزوں کا مقصود و منتہیٰ	ادارہ	4
ہماری درخواست عدالتِ عالیہ میں	خواجہ ازہر عباس، کراچی	11
یکم مئی	سید حیات النبی رضوی، کراچی	23
روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں	ادارہ	29
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر: 6)	محمد علی صابر صدیقی	32
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے	پرویزؒ	38
بچوں کا صفحہ: ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	ادارہ	57

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 6 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویز صاحبؒ کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (2:183۔187) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔(4:113)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183)۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)۔

تَتَّقُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُوْنَ ' سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃً الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط (10:78)

''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہۂ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں' یارائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (45:37)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ (43:84)۔ ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار ازخود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی ازخود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ''اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے''۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:1-2)۔ ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا''۔ اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۔ (17:111) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ ۭ (59:23) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (13:9) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (22:62)۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)' تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔

جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ ونصیحت یا تقاریر وخطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ (9:40)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت ورفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)۔ ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ وتسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الاعلی کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں' جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہر مانیت ہے' مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط (7:146)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2 ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور

جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185)۔ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (10:58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزں کا مقصد۔ یعنی وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ:

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' وَالْمَلٰٓئِكَةُ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:17) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہماری درخواست عدالتِ عالیہ میں

مغربی نظام جمہوریت کی، اور دیگر تمام سیکولر نظاموں کی سب سے بڑی خامی و کمزوری یہ ہے کہ ان نظاموں کی کوئی بنیاد یا اساس نہیں ہوتی۔ کمیونزم ایک اچھا، نظام تھا، لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی کہ کوئی انسان اپنا کمایا ہوا پیسہ دوسروں پر کیوں خرچ کرے، اسی بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ناکام ہوگیا۔ کمیونزم کے متعلق ہی علامہ اقبال کا وہ مشہور شعر ہے جس میں انہوں نے فرمایا:

اے کہ می خواہی نظام عالمے جستہ ای او را اساس محکمے

ترجمہ: اے وہ شخص کہ جو دنیا میں ایک نظام قائم کرنا چاہتے ہو، کیا تم نے اس نظام کی بنیاد تلاش کر لی ہے؟ لیکن یہ تو عقل انسانی کی عاجزی ہے کہ وہ کسی بھی نظام کی اساس تلاش نہیں کر سکتی۔ کسی بھی نظام کی اساس طے کرنا عقل انسانی کے دائرے سے باہر ہے۔ اسی لئے مغربی جمہوری نظام بھی ناقص اور بدترین نظام ہے۔ یہ صرف وحی الٰہی ہی ہے جو اپنے نظام کی اساس مہیا کرتی ہے اور اسی اساس پر اپنے نظام کو قائم کرتی ہے۔ ہم اس کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں آگے کریں گے۔

(2) جمہوریت کی دوسری خامی یہ ہے کہ عقل انسانی Good and Evil یعنی خیر و شر کو Define ہی نہیں کر سکتی (2:216)، مغرب کے فلاسفر اور دانشوروں نے خیر و شر کے تعین کی بہت کوششیں کیں، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے اور قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اس کام میں آئندہ بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ خیر و شر کا مسئلہ عقل انسانی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا، اس کا تو لوگوں کے جذبات سے تعلق ہے لیکن چونکہ جذبات تو ہر شخص کے انفرادی ہوتے ہیں، اس لئے مغرب میں خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہے۔ خیر و شر کے انفرادی معیار ہونے کی وجہ سے اخلاقیات کی کوئی بنیاد نہیں رہتی اور یہ ساری اخلاقیات Relative بن جاتی ہے۔ مغربی فکر کے نزدیک اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں ہے۔ بچے کو جو کچھ اس کے معاشرے میں سکھا دیا جاتا ہے۔ وہ ہی اس کا معیار اخلاق بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں Objectivity نہیں ہوتی اور ان کا معیار عقل انسانی ہوتی ہے۔

مغربی جمہوریت میں چونکہ اخلاق کا معیار انفرادی ہوتا ہے۔ اس لئے سیاستدانوں اور حکمرانوں میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ وہ اپنے، اپنی پارٹی، اپنے وطن کے مفادات کے علاوہ انسانیت کے مفادات کو سامنے رکھ ہی نہیں سکتے۔ عراق، شام، فلسطین، کشمیر، بوسنیا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ آج ساری دنیا میں اس وجہ سے فساد ہی فساد ہے۔ جو سیاستدانوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ قرآنِ کریم خیر وشر میں بڑا واضح امتیاز کرتا ہے۔ جس کی وضاحت ہم آگے اسی مضمون میں کریں گے۔ خیر وشر کے تعین کے بعد قرآنِ کریم بلند آواز میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ: وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ط (13:17) ترجمہ: اور جس چیز سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔ جو کچھ تم صرف اپنی ذات کے لئے کرتے ہو وہ تمہاری ذات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ تم پوری انسانیت کے فائدے کے لئے کرتے ہو وہ باقی رہتا ہے۔

(3) مغربی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ عوام کا ہوتا ہے ہمارے ہاں ہر وقت عوام کی عدالت کا چرچا ہوتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ عوام کی عدالت کے فیصلہ کو قانونی عدالتوں کے فیصلے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ نظامِ جمہوریت میں ایسے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے جو فنِ حکومت کے ماہر نہیں ہوتے۔ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے میڈیکل سائنس کے کسی اہم سوال کے بارے میں عوام کی کثرتِ رائے سے فیصلہ کر لیا جائے اور اس میں کسی ایک ڈاکٹر کی بھی رائے لے لی جائے۔ حکومت جیسے اہم فریضہ کو عوام کے سپرد کرنا بہت بڑی نادانی کی بات ہے۔ حکومت چلانا ایک مشکل کام ہے۔ ہر شخص حکومت نہیں چلا سکتا۔ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو ملک کے بہترین اور اہل لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنی عقل وفکر کے ذریعے عوام کی سطح کو بلند کرتے چلے جائیں اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ (4:58)، اس کا ترجمہ عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں، امانت والوں کو واپس دے دو۔ یعنی اگر کوئی شخص تمہارے پاس کوئی امانت رکھے تو اس کو عندالطلب اُسے واپس کر دو۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے۔ لیکن یہ بات پوری نہیں ہے۔ درسی لغات، مصباح اللغات میں امانت کا ترجمہ فریضہ خداوندی لکھا ہے۔ اپنے اختیارات اور اقتدارات ان لوگوں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔ اس موجودہ نظام جمہوریت میں جب ہم اپنا ووٹ کسی کو دیتے ہیں تو وہ اپنا اختیار دوسرے کے سپرد کرتے ہیں کہ میری طرف سے تم وہاں وہ بات کرو جو میرے مفاد میں ہے۔ جمہوریت میں یہ نقص ہے کہ آپ جب بھی اپنے اختیارات دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یعنی اپنا ووٹ کسی کو دے دیتے ہیں، وہ آپ کا مفاد پیش نظر نہیں رکھتا۔ وہ اپنا مفاد پیش نظر رکھتا ہے لیکن آپ پانچ سال کے لئے اپنے ہاتھ کٹوا کر اس کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

(3) جمہوریت کا تیسرا عیب یہ ہے کہ اس میں کوئی غریب آدمی حصہ نہیں لے سکتا۔ جمہوریت کا نظام الیکشن کے ذریعے چلتا ہے اور الیکشن میں کوئی غریب آدمی حصہ لے ہی نہیں سکتا۔ اس میں اربوں روپے خرچ کر کے ووٹوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ ہی ممبر بن سکتا ہے۔ خواہ وہ اس عہدہ کے لئے کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو۔

(4) جمہوریت کا چوتھا عیب یہ ہے کہ اس میں قوانین کی اطاعت کی بجائے انسانوں کی اطاعت کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کی حکومت، دوسرے انسان پر بالکل حرام ہے (3:79، 12:40، 5:50) جو انسان دوسرے انسان کی بخوشی اطاعت کرتا ہے اور اس کی محکومیت اختیار کرتا ہے وہ شخص بے شرف اور بے غیرت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ اس معاملے میں انسان کتے سے بھی زیادہ بے شرم ہے کہ

من ندیدیم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کتا دوسرے کتے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو۔ بے غیرتی اور بے شرمی کے علاوہ وہ معصیت خداوندی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (5:44، 45، 47) ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ظالم، اور فاسق ہیں۔ ان تینوں آیات کی تفسیر کے ذیل میں مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں ایک یہ کہ وہ کافر ہیں دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کے ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا۔ اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہوکر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا، تو درحقیقت بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔''

(5) مغربی جمہوریت کا پانچواں عیب یہ ہے کہ اس میں ایک بڑی اقلیت کو اکثریت کا محکوم رہنا پڑتا ہے۔

(6) مغربی جمہوریت کا چھٹا عیب یہ ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوتا ہے اور اسی کا ایک شاخسانہ پانامہ لیکسز Leaks ہے۔ زیر بحث یہ بات ہے کہ اربوں پاؤنڈ کی رقوم پاکستان سے باہر جائز طور پر گئی ہیں یا ناجائز طور پر گئی ہیں۔ حالانکہ اصل بات اعتراض کی یہ ہے پاکستان جیسے غریب ملک میں لوگوں کو جھونپڑی نصیب نہیں اس غریب ملک کے لیڈروں اور حکمرانوں کو یہ بات مناسب ہی نہیں کہ وہ اتنے قیمتی مکانات خرید کریں۔ لیکن یہاں کوئی اس اخلاقی نکتہ کو اٹھا ہی نہیں رہا یہاں یہ بحث ہے کہ رقوم قوانین کے مطابق گئیں یا نہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اُنہیں حاصل ہے اگر

وہ رقوم خلاف قانون گئیں تو یہ خود اس کو قانون کے دائرے میں لے آئیں گے۔ لیکن اصل اخلاقی اعتراض یہ ہے کہ غریب لوگوں کے نمائندوں اور ان کے ہمدروں کو اتنے قیمتی فلیٹ خریدنے نہیں چاہئیں۔ جمہوریت کے برعکس و برخلاف قرآن کے نظام میں یہ حکم ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں، ان سے کہہ دو ضرورت سے زیادہ جو کچھ بھی ہے دوسروں پر خرچ کردو۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ﴿۳۹﴾ (53:39) ترجمہ: انسان کے لئے صرف وہ جائز ہے جو اس نے خود اپنی محنت سے کمایا ہو۔ اور یہ دونوں حکم وہ ہیں جنہیں کوئی انسان بدل نہیں سکتا۔ قرآن میں تو دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ سارے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں دولت جمع کرنے کی اجازت دی گئی ہو۔

(7) مغربی جمہوریت کا ساتواں بڑا عیب یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30:31) اور مختلف آیات میں فرمایا ہے کہ فرقہ بندی کرنیوالوں کا نہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق رہتا ہے (6:160) اور نہ خدا سے۔ فرقہ بندی کرنے والوں کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری کا عذاب ہوتا ہے (20:134) بھوک اور خوف کا عذاب ہوتا ہے (10:112) برکات سماوی وارضی کے لئے دروازوں کے بند ہوجانے کا عذاب ہوتا ہے (7:96) قرآن کریم کی رُو سے دین اور سیاست ایک ہی چیز ہوتی ہے ان کے مابین کوئی تفریق نہیں ہوتی، اس لئے نظامِ جمہوریت پر اور ان سب جمہوری پارٹیوں پر ان آیات کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے جس طرح دین اور دینی اداروں پر ہوتا ہے۔ نظامِ جمہوریت کی اساس شرک پر قائم ہوتی ہے۔ اور ویسٹرن نظامِ جمہوریت اور یہ تمام پارٹیاں ان عذاب کی مستحق ہیں جن کا حوالہ ہم نے ان آیات میں دیا ہے۔

(8) مغربی جمہوریت کا آٹھواں عیب یہ ہے کہ اس نظام میں صدرِ مملکت کو Immunity حاصل ہوتی ہے۔ صدرِ مملکت سے اگر دورانِ صدارت کوئی غلطی یا جرم سرزد ہوتا ہے تو اس کی صدارت کے دوران اس کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ نے اسلامی مملکت قائم فرمائی۔ اس مملکت کے صدر خود حضور ﷺ رہے ان کی ذمہ داریوں کے مطابق قرآن کہتا ہے اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (17:75)، اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں میں دُگنا عذاب دیں گے۔ یہ دوگنے عذاب کی دھمکی رسول اللہ ﷺ کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے تھی جن کے رتبے جتنے بلند ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں اونچی ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی سزا بھی زیادہ ہوتی ہے۔ حضور ﷺ تمام شہریوں سے زیادہ قوانین کا اتباع کرتے تھے (39:12)۔ نظامِ جمہوریت میں صدرِ مملکت کو استثنیٰ دینا قرآن کے خلاف ہے۔ اس کو دوگنی سزا دینی چاہئے۔

اسی طرح صدرِ مملکت کی بیوی First lady کو بھی دوہری سزا دینے کا حکم قرآن میں آیا ہے۔ ارشادِ عالی يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ (33:30) ترجمہ: اے نبی کی بیویو تم میں

سے جو کوئی بے حیائی کا کام کرے گا اس کو دوہرا عذاب ہوگا۔ تم میں سے اگر کسی سے ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تو یاد رکھئے عام عورتوں کو جو سزا ملے گی، تمہیں اس سے دُگنی سزا ملے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنی مملکت میں کوئی قانون نافذ کرتے تھے تو پہلے اپنے گھر آ کے کہتے تھے کہ یہ قانون کل سے نافذ ہوگا۔ تم آج سے ہی اس کے مطابق گھر میں عمل شروع کر دو۔ اس لئے کہ آپ عام عورتوں جیسی عورت نہیں ہیں۔ آپ پر مملکت کی اطاعت کرنا دوسری عورتوں سے زیادہ ضروری اور لازمی ہے۔

اب ہم آپ کو اسلامی نظام کی اساس و بنیاد بتاتے ہیں اور آپ یہ غور فرمائیں کہ یہ بنیاد کس درجہ مضبوط ہے۔ اس کے بعد خیر و شر کے مسئلہ کا حل پیشِ خدمت عالی کیا جائے گا۔

زندگی The Life، ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے آگے بڑھی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی Energy، ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روح کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روح کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ توانائی تو ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع مجموعی طور پر ملتی ہے تو نفس کے لفظ سے پکاری جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں لیکن قرآنِ کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' پر مشتمل قرار دیتا ہے۔ یہی انسان کی ذات کہی جاتی ہے۔ نفس یا ذات کو Define نہیں کیا جا سکتا۔ اس ذاتِ انسانی کو نشوونما دینا انسان کی زندگی کا فریضہ ہے جو شخص اس کو پوری طرح نشوونما دے دے گا۔ وہ انسانی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہے گا اور مرنے کے بعد اگلی نوع حیات میں ترقی کرتا جائے گا۔ یہی انسان کا جنت میں جانا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی نشوونما نہیں کرے گا وہ اسی مقام پر رکا رہے گا اور یہ اس کا جہنم میں رہنا ہوگا۔

میں جب آپ سے گفتگو کرتا ہوں، اور میرا ہاتھ، میرے پاؤں، یا میرے بازو وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا ہوں، تو یہ چیز میرے جسم کے علاوہ، اور اس کی غیر ہوتی ہے کیونکہ مضاف ہمیشہ مضاف الیہ کا غیر ہوتا ہے۔ یہ ہی میری ذات ہے جو یہاں مضاف الیہ ہے میں جب گانا سنتا ہوں تو مجھے سرور محسوس ہوتا ہے، بعض اوقات میں کسی معاملہ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں، مجھے کبھی خوف بھی محسوس ہوتا ہے، کبھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ سب کیفیات میری ذات یا نفس کو محسوس ہوتی ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس وقت فکری طور پر دنیا میں دو نظریہ ہائے حیات رائج ہے۔ ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف یہ طبعی زندگی ہے۔ انسان یہ زندگی طبعی قوانین کے مطابق بسر کرتا ہے۔ اس جسم کی پرورش ان طبعی قوانین کے مطابق ہوتی رہتی ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ آج بھی رائج ہے اور ہر نظریہ

نزولِ قرآن کے وقت بھی موجود تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (45:24) ترجمہ: کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم طبعی قوانین کے مطابق مرتے اور جیتے ہیں اور وہ ہی ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ قرآنِ کریم اس زندگی کو حیوانی سطح کی زندگی گردانتا ہے۔ یہ مادی نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ آج کل زیادہ ممالک، خصوصاً مغرب میں یہی تصورِ حیات رائج ہے۔

دوسرا تصورِ حیات وہ ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اس مقصدِ حیات کے قائل ''نفس انسانی'' پہ یقین رکھتے ہیں۔ مرنے کے بعد ذات انسانی کے زندہ رہنے اور اگلی نوع حیات میں ترقی کرنے کے قائل ہیں۔

جمہوری نظام میں چونکہ ''انسانی ذات'' کا تصور نہیں ہوتا اس لئے اس کے سامنے صرف جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ جس کے سامنے رزق کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ مملکت میں بہترین law and order ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تعلیم اور علاج کی سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔ اس مملکت کے سامنے یہ مقاصد ہوتے ہیں اور مملکت مقصود بالذات ہوتی ہے آپ ایک مملکت میں یہ چیز فراہم کر دیں۔ ریاست کا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اسلامی مملکت میں صرف جسم کی ضروریات سامنے نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کا مقصد ''ذات'' کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کا اصل مقصود ہی ذات کی پرورش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست مقصود بالذات نہیں ہوتی، یہ مقصود بالغیر ہوتی ہے اور وہ غیر، ذات انسانی کی پرورش ہے جس سے یہ ذات ارتقاء کی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

جسم کی پرورش طبعی قوانین کے ذریعے ہوتی ہے۔ لیکن ذات انسانی چونکہ مادی چیز نہیں ہے اس لئے اس کی پرورش میں طبعی قوانین کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انسانی ذات کی پرورش قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کے اپنے وضع کردہ قوانین کے ذریعے نہیں ہو سکی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت وحی الٰہی کی محتاج ہوتی ہے۔ ارشادِ عالی ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ (4:49) کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس مزکی ہوتا جا رہا ہے بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (4:49) یاد رکھو انسانی ذات کی نشوونما قوانین خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ جنہیں اس نے اپنی مشیت کے مطابق بذریعہ وحی عطا کیا ہے۔ جو شخص بھی اپنی ذات کی نشوونما چاہتا ہے تو ان قوانین خداوندی کا اتباع کرے گا۔ تو اسے نشوونما حاصل ہوگا اور اس کی کوششوں کے نتائج میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔

تجدید یادداشت کے لئے عرض ہے کہ قرآنِ کریم نفس انسانی یا ذات انسانی کی نشوونما کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ یہ نفس جس قدر ترقی کرے گی۔ اسی قدر یہ مضبوط بھی ہوگی۔ یہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہے گی اور بلند سے بلند مراتب و مناصب حاصل کرتی چلی جائے گی۔ قرآنِ کریم اس نفس انسانی کو اسلامی مملکت کی اساس قرار دیتا ہے۔ نفسِ انسانی کی پرورش کے قرآنِ کریم نے چار طریقے بتائے ہیں۔ ہم ان چار طریقوں کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(1) پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت سے ذات انسانی کی نشوونما ہوتی ہے فرمایا: وَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ

نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (2:286)، خدا جو تم پر یہ قوانین کی اطاعت فرض کر رہا ہے تو اس سے تمہاری نفس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے مزید فرمایا: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ (2:286)، ذات کی وسعت اور ترقی کے لئے قرآن کا یہ قانون ہے کہ نفس جس غلط کام کا ارتکاب کرتی ہے، اس سے اس کو نقصان ہوتا ہے اور جو صحیح کام کرتی ہے اس سے اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ عربی گرائمر کا ایک باریک نکتہ ہے کہ عربی میں لَھا کا جو ''لام'' آتا ہے وہ فائدہ کے لئے ہوتا ہے اور ''لام نافع'' کہلاتا ہے۔ اور علیھا میں جو لام آتا ہے وہ نقصان کے مفہوم میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے اور اسلامی مملکت کا ہر شہری اپنے نفس کو نشوونما دینے کے لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اس اطاعت سے مملکت کا کاروبار بھی درست ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں جب ایک آدمی کار چلاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ اس ریاست میں قوانینِ خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ٹریفک سگنل کی اطاعت سے اس کے نفس کو بالیدگی ہوگی۔ ہر شہری قرآنی حکومت کے ٹیکس اس لئے ادا کرتا ہے کہ ٹیکس دینے سے اس کی نفس کو ترقی ملتی ہے اور ٹیکس نہ دینے سے اس کا نفس مضمحل ہوتا ہے۔ اس قرآنی ریاست میں جرائم کا انسداد خود بخود ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جرائم کے ارتکاب سے اس کا نفس کمزور ہوجاتا ہے۔ اس ریاست میں Sin اور Crime (گناہ اور جرم) ایک ہوجاتے ہیں جو شخص گناہ نہیں کرتا وہ جرم بھی نہیں کرتا۔ آپ اپنے تصور میں غیر اسلامی ریاست کا تصور لائیں کہ ایک شخص روزہ سے ہے سخت گرمی ہے اور وہ شخص تنہا ہے اور اس کے پاس ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ سخت پیاس کے باوجود وہ روزہ نہیں توڑے گا اور ٹھنڈا پانی ہرگز نہیں پیئے گا۔ کیونکہ وہ اسے گناہ سمجھتا ہے۔ لیکن وہ ہی شخص جب باہر جاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی پاسداری نہیں کرتا، اور اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سگنل کی خلاف ورزی کرنے سے وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے۔ صرف جرم کر رہا ہے اور جرم کی سزا سے وہ اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ سیکولر سٹیٹ میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی چیز اس کو جرم سے نہیں روک سکتی۔ اسلامی سٹیٹ میں چونکہ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی صرف جرم نہیں ہوگی بلکہ گناہ بھی ہوگی اور اس کا اس کے نفس پر بُرا اثر پڑے گا اس لئے وہ یہ جرم اور گناہ نہیں کرے گا اور اس طرح نفس انسانی اس نظام کی اساس بن جاتی ہے، اور یہ نہایت مضبوط اساس ہوتی ہے۔

یہ اس لئے بھی اسلامی نظام کی اساس بنتی ہے کہ غیر اسلامی نظام میں قوانین خداوندی کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس سے قرآن نے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ عالی ہے وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (26:151-152) ترجمہ: اور بیباک لوگوں کا کہنا نہ مانو، جو ملک میں خرابی کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ شیخ الہند نے مسرف کا ترجمہ بیباک کیا ہے اور دیگر مترجمین نے بدنگاہ وغیرہ کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ترجمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے خود اس لفظ کی وضاحت کردی الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (26:152)، مسرفین وہ ہیں جو ملک میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ یہ غیر اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ اس

میں زندگی بسر کرنے سے منع کیا گیا ہے (6:123) ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے (4:97) اس میں آپ انسانوں کے وضع کردہ قوانین سے بچ نہیں سکتے یہ حرام ہے کہ کوئی انسان، دوسرے انسان کا محکوم ہو، حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری۔

(2) نفس انسانی کو نشوونما دینے کا دوسرا ذریعہ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنا ہے الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰىۚ﴿۱۸﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال، دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کا نفس ترقی کرتا ہے فرمایا: وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۶﴾ (64:16) ترجمہ: اور اپنی بھلائی کے لئے خرچ کرتے جاؤ اور جس نے اپنے کو لالچ سے بچالیا سو وہ ہی لوگ کامیاب ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ (2:272) اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو یہ تمہاری نفسوں کے لئے ہیں۔ جو شخص اپنی ذات میں Believe کرے گا وہ اپنی ذات کی نشوونما کرنے کے لئے دوسروں پر خرچ کرے گا۔ جو شخص اپنی ذات میں ہی Believe نہیں کرتا، نہ اس کی نشوونما میں یقین رکھتا ہے وہ دوسروں پر کیوں خرچ کرے گا۔ کمیونزم اسی لئے ناکام ہوا کہ اس میں کوئی incentive کام کرنے کا نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس نظام کی کوئی اساس تھی کہ آدمی کیوں اتنا کام کرے کہ اپنی کمائی دوسروں پر خرچ کرے۔ اپنی نفس کی نشوونما کے لئے دوسروں پر خرچ کرنے کے متعلق قرآن میں لاتعداد آیات ہیں۔ ہم ان پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔ سورۂ البقرہ میں ارشاد ہے: وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دے جو اپنے خرچ سے بچے۔ قرآن کریم میں ضرورت سے زیادہ رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جب کسی کے پاس دولت ہی نہیں ہوگی تو وہ Money Laundering کیسے کرسکتا ہے۔ اور جب ریاست سب ضروریات پوری کرتی ہے، تو کوئی دولت کس لئے جمع کرے گا۔

جسم انسانی کی پرورش کچھ لینے سے ہوتی ہے۔ ہر شخص روزانہ کھانا کھاتا ہے۔ لیکن نفس انسانی کی پرورش دوسروں کو دینے سے ہوتی ہے جسم اور نفس دونوں کی پرورش کے طریقے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ صرف اسلامی نظام ہی بیک وقت دونوں کی پرورش کرسکتا ہے، اس لئے اسلامی نظام قائم کیا جاتا ہے۔

(3) نفس انسانی کو نشوونما دینے کا تیسرا طریقہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنا ہے۔ روحِ خداوندی اور انسانی ذات ایک ہی چیز ہے۔ قرآنِ کریم نے جو ''نفخ روح'' کی اصلاح استعمال کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی صلاحیت Potential انسان کو عطا کردیا ہے۔ اب انسان میں، ربوبیت رزاقیت، رحم، کرم، فضل، السلام کی ساری صفات انسان میں موجود ہیں۔ ہر انسان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان صفات کو اپنے میں پیدا کرے۔ جس قدر صفاتِ خداوندی کسی میں پیدا ہوں گی۔ اسی قدر اس کو قربِ الٰہی حاصل ہوگا اور انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوگا۔ جب حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا مظاہرہ کرے تو اس نے اس عالم کو خلق فرمایا (65:12)، یعنی زمین و آسمان کی تخلیق،

اوران کا کل نظم ونسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علمِ محیط وغیرہ صفات کی معرفت انسانوں کو حاصل ہو۔ تخلیقِ عالم سے یہ غرض بوجۂ اتم جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات کا اظہار ہو۔ یہ صرف اسلامی مملکت میں ہی ہوسکتا ہے اور اسی لئے اسلامی مملکت کا قیام ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر صفاتِ کمالیہ کے اظہار ہونے کی کوئی اور دوسری صورت نہیں ہے۔ اس دنیا کا سارا نظام ایسا ہی رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیقِ عالم کی حکمت ومصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی موقع نہ رہتا، مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم وغیرہ صفات کا ظہور نہ ہوسکتا۔ حالانکہ عالم کو پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہوجائے۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہو انجام کار اس کے علاوہ کوئی دوسری غرض نہیں بتلا سکتا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ رازق ہے، رب ہے، کریم ورحیم ہے۔ اس وقت ان صفات پر ہم صرف ایمان لاتے ہیں۔ اسلامی نظام میں ان صفات پر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ صفاتِ خداوندی اس بات کی مقتضی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ اسلامی مملکت پر صفاتِ خداوندی جگمگ جگمگ کرتی دکھائی دیتی ہیں کیونکہ ان پر عمل ہورہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ذات حضرت باری تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ مملکت میں جلوہ افروز ہوگئی ہے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) زمین اپنے رب کے نور سے چمکدار بن جاتی ہے۔ اس مملکت میں ہر انسان میں صفاتِ خداوندی ازخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صفاتِ خداوندی کا موضوع بہت دقیق اور بہت دلچسپ ہے۔ اس کی تفصیل علم الکلام کی کتب میں ملتی ہیں۔ لیکن وہ سب کتب عربی زبان میں ہیں اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' میں اس مضمون کو Touch بھی نہیں کیا۔ البتہ مولانا اویس کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے، اپنی کتاب علم الکلام میں صفاتِ خداوندی پر کئی صفحات لکھے ہیں، لیکن وہ سب مذہبی نگاہ سے تحریر کئے گئے ہیں۔ دینی نکتہ نگاہ سے نہیں لکھے گئے۔ البتہ انگریزی زبان میں اس موضوع پر کچھ مواد ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس کو اپنی ویب سائٹ پر ڈال دیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(4) چوتھا ذریعہ نفس انسانی کے استحکام کا مستقل اقدار پر عمل کرنے کا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی راہنمائی کے لئے جو اصول عنایت فرمائے ہیں۔ وہ ہی مستقل اقدار ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما بھی ان اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ اقدار درحقیقت انسانی ذات کی بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ جس قدر انسانی ذات نشوونما پاتی ہے اسی قدر اس میں صفات خداوندی کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی پر ہی مبنی اسلامی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے۔ جب انسان کے ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie پڑتی ہے تو اپنے ذاتی مفاد کو چھوڑ کر مستقل قدر پر عمل کرنے سے ذات انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان اقدار کو وضع کرنا، عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ہر انسان اس موقع پر وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ مستقل اقدار میں ربوبیت، تکریم انسانیت، وحدت انسانیت تعاون علی البر والتقویٰ، کائنات کا بالحق پیدا ہونا، آزادی، عدل وانصاف وغیرہ اہم

اور نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ مستقل اقدار کا موضوع بہت طویل ہے ہم نے بقدر ضرورت تحریر کر دیا ہے۔

(5) نفس انسانی کو نشوونما دینے کا پانچواں طریقہ اقامت دین کی کوشش کرنا ہے جو لوگ اقامت دین کے لئے کوشش کرتے ہیں ان کا وہی مقام ہوتا ہے جو ایک رسولؑ کے ساتھیوں کا ہوتا ہے۔ (9:100) اس آیت کے ذیل میں مولانا محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں بحث کی ہے کہ تفسیر نمونہ نے معارف القرآن سے بھی زیادہ توجہ اس آیت پر دی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں دین کسی جگہ بھی قائم نہیں ہے۔ ساری دنیا میں صرف تحریکِ طلوعِ اسلام دین کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان حضرات کا شمار متبعین بالاحسان میں یقیناً ہوتا ہے۔ چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اس شق کے متعلق ہم نے بہت مختصر تحریر کیا ہے۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ شق اول نمبر پر آتی ہے۔

عدل قرآنِ کریم کی ایک بنیادی اور اہم ترین مستقل قدر شمار ہوتی ہے جماعت مومنین کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ عدل قائم کریں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ (16:90)، اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے تو یقیناً وہ قوانین بھی دے گا اور اس کا منشاء یہی ہوگا کہ اس کے قوانین کے مطابق عدل و احسان کیا جائے۔ اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہوسکتا کہ برطانیہ یا بھارت کے قوانین کے مطابق عدل کیا جائے۔ برطانیہ میں ہم جنس پرستی جیسے قوانین موجود ہیں۔ بھارت میں ذات پات اور جاتی سسٹم کی وجہ سے انسان کی تکریم نہیں ہوسکتی۔ مزید یہ کہ آیت میں عدل اور احسان دونوں کا حکم ہے۔ احسان کا تصور قرآن کے علاوہ اور کسی معاشرہ میں ہے ہی نہیں۔ اس آیت کا واضح مفاد و منشاء یہ ہے کہ انسان کے وضع کردہ قوانین کو رد کر دیا جائے اور فرمایا: وَ مِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۸۱﴾ (7:181) ترجمہ: اور ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ الحق (وحی الٰہی) کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اور اسی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

ہر نظام عدل، کی بنیاد شہادت پر ہوتی ہے، قرآنِ کریم نے جو شہادت کا اصول بیان فرمایا ہے انسانیت آج تک اس اصول کو پوری طرح اختیار نہیں کر سکی ارشادِ عالی ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰہُ اَوۡلٰی بِہِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡہَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَ اِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۳۵﴾ (4:135)، ترجمہ: اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ ایمان پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو، اگرچہ یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ، یا قرابت داروں کے خلاف ہو، خواہ مالدار ہو، یا محتاج، کیونکہ خدا تو ان پر زیادہ مہربان ہے۔ تم حق سے کترانے میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرو اور اگر گھما پھرا کے گواہی دو گے یا انکار کرو گے، تو جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خوب واقف ہے۔

ہر مقدمہ میں گواہ کسی نہ کسی پارٹی کا ہوتا ہے یا گواہ مدعی کی طرف سے ہوگا۔ یا مدعی علیہ کی طرف سے پیش ہوگا۔ جب بھی کوئی گواہ کسی کی طرف سے بھی جائے تو اس کی ہمدردی اور میلان اسی کی طرف ہوگا۔ اس طرح کا رجحان ایک فطری اور قدرتی

امر ہے لیکن قرآن اس رجحان کی جڑ اس طرح کاٹ دیتا ہے جبکہ وہ فرماتا ہے کہ تم نہ مدعی کی طرف سے ہو اور نہ مدعی علیہ کی طرف سے ہو۔ تم صرف خدا کی طرف سے پیش ہو رہے ہو اور کسی کی بھی طرفداری نہ کرو، پھر فرمایا، خواہ وہ شہادت خود تمہاری ذات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ تمہارے ماں باپ کے خلاف ہو، اور خواہ امیر و غریب کے خلاف ہو فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ (4:135)، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے۔

قرآن نے دشمنوں تک سے بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے ایسا حکم صرف قرآن ہی دے سکتا تھا کیونکہ انسان اپنے جذبات سے الگ نہیں ہو سکتا فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (5:8) اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسا دے کہ ان سے ناانصافی کرو۔ تم ان سے ہر حال میں انصاف کرو کیونکہ یہی تقویٰ کے قریب ہے۔

مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اپنے فیصلے صرف رسول اللہ ﷺ سے کراؤ پھر رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا: ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65)، پھر مومنوں کو اس کے فیصلے کے خلاف دل میں کوئی خلش نہیں رہتی، پھر ان کے فیصلوں کو دل کی آمادگی اور خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات اسلامی نظام اور اس کے قوانین میں ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہی اسلامی نظام کی بنیاد ہے۔

ہم نے شروع مضمون میں تحریر کیا تھا کہ عقل انسانی خیر و شر کا مسئلہ آج تک حل نہیں کر سکی اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ عقل انسانی یہ مسئلہ حل بھی نہیں کر سکے گی۔ اگر عقل انسانی یہ مسئلہ خود حل کر سکتی تو پھر وحی الٰہی یا قرآن کے نزول کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو بیشک حل کیا ہے۔ اس نے کہا من شر ما خلق اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ طبعی طور پر اپنی خلقت کے لحاظ سے خیر ہی خیر ہے۔ البتہ ہر چیز کا استعمال اس کو خیر و شر بنا دیتا ہے۔ زہر کے چند قطرے دوا کے اندر نہایت فائدہ مند ہوتے ہیں، لیکن زہر کے سو قطرے ان کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔ پانی جیسی نعمت خداوندی جو انسان کو زندگی بخشتی ہے۔ اسی پانی میں آدمی ڈوب کر فوت ہو جاتا ہے۔ آگ انسان کی زندگی میں موقع بہ موقع کام آتی ہے۔ اسی آگ میں اگر انگلی ڈال دی جائے تو جل جاتی ہے تو وہ سخت تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کو خدا کے قوانین کے مطابق استعمال کرنے سے خیر ہی خیر واقع ہوتا ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے، شر کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس کا واضح حل یہ ہے کہ کسی چیز کو مستقل اقدار کے مطابق استعمال کرنے سے وہ خیر ہے اسی چیز کو مستقل اقدار کے خلاف استعمال کرنے سے وہ شر ہی شر ہے۔ اللہ تعالیٰ، سبحانہٗ خیر کا منبع و مصدر ہے۔ اس کی پیدا کردہ ہر چیز خیر ہے۔ اس نے صرف خیر پیدا کیا ہے۔ اشیاء کائنات کے غلط استعمال کرنے سے شر پیدا ہوتا ہے جس سے بچنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے (113:2) اسی طرح عدالتی نظام کے قوانین ہیں۔ عدالتی نظام کے قوانین اگر مستقل اقدار کے خلاف وضع ہوں گے تو شر ہی شر پیدا ہوگا۔ اگر ان قوانین کو مستقل اقدار کے مطابق تشکیل دیا جائے گا تو معاشرہ میں خیر ہی خیر فروغ پائے گا، اور وہ قوانین عدل و انصاف اور احسان پر قائم ہوں

گے۔عدالت عالیہ وعظمیٰ کا کام یہ ہے کہ وہ موجودہ قوانین کو مستقل اقدار کے مطابق رفتہ رفتہ تبدیل کرتی جائے۔

ہم صرف نمونہ کے طور پر چند اقدار تحریر کرتے ہیں ورنہ قرآنِ کریم تو ان سے بھرا پڑا ہے۔

(1) جس مملکت کے قوانین مستقل اقدار کے مطابق جاری ہوں گے، اس مملکت کی اطاعت، عبادت خداوندی ہوتی ہے۔اس مملکت میں پرستش کی ضرورت نہیں رہتی۔اس مملکت میں عدالتیں، تھانے، تحصیلیں سب مساجد اللہ ہوتے ہیں کیونکہ وہاں سے احکامات خداوندی جاری ہوتے ہیں۔

(2) قرآن بدنی سزائیں تجویز کرتا ہے۔ہمارے جن لیڈروں نے لوٹ مار کی۔ان کو گیارہ گیارہ سال کی قید درست نہیں کرسکی۔اگر ان کو بدنی سزا دی جاتی تو وہ لوٹ مار سے اجتناب کرتے۔

(3) اسلامی مملکت میں مستغیث مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا وہ حکومت کے خلاف مدعی ہوتا ہے قرآن کے نزدیک وہ خاص فرد مجرم نہیں جس نے ارتکاب جرم کیا۔مجرم نظام معاشرہ اور خود عدالتیں ہیں۔

(4) قصاص کے معنی صرف جرم کی سزا دینا نہیں ہے۔اس کے معنی مجرم کا ایسا پیچھا کرنا، کہ اس کو پکڑ لیا جائے۔اسلامی مملکت میں کوئی مجرم سزا سے بچ نہیں سکتا۔

(5) جرم کی سزا جرم کے مطابق ہونی چاہئے۔اس سے کم یا زیادہ نہ ہو۔وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (42:40) کسی جرم کی سزا زیادہ یا کم نہیں ہونی چاہئے۔

(6) سزا بطور انتقام کا تصور غیر قرآنی ہے۔سزا اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ آئندہ جرم نہ کرے اور معاشرہ جرائم سے محفوظ رہے۔

(7) کسی بھی قانون کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد ہوگا۔اگر کسی نے کوئی جرم قانون کے نفاذ سے پہلے کیا تو اس کی گرفت نہیں ہوگی قرآن نے کئی قوانین کے بعد اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ (4:23) جو اس سے پہلے ہوگیا۔اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔

(8) جس فعل کے ارتکاب میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔اس پر مواخذہ نہیں ہوگا وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ (33:5) ترجمہ: جو کچھ تم سے غلطی سے ہوجائے اس پر مواخذہ نہیں۔ مواخذہ اس فعل پر ہے جس میں تمہارا ارادہ ونیت شامل ہو۔

(9) عدل وانصاف ہر شہری کا حق ہے۔یہ ملتا ہے اور بروقت ملتا ہے۔

(10) ججوں کے متعلق فرمایا کہ سزا دینے میں ترس نہ کھاؤ۔وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24:2)، اسلامی مملکت میں مجرم کو سزا دینے میں نرمی نہ کرو۔آپ حضرات عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔آپ کے جذبات یہ سزا دینے میں روک نہ بن جائیں۔

ہماری درخواست عدالت عالیہ سے یہی ہے کہ ان قوانین کو قرآنی مستقل اقدار کے مطابق کرلیں اور اگر اس معاملہ میں کسی مدد کی ضرورت ہو تو ادارہ طلوعِ اسلام اس میں تعاون کرنے کے لئے بخوشی حاضر ہے۔

سید حیات النبی رضوی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکم مئی

قرآن کریم کی رُو سے ہر انسان محنت کش ہے

یکم مئی 1886ء کو ''ھے مارکیٹ اسکوائر'' شکاگو امریکہ میں ایک بڑا حادثہ رونما ہوا جس کا اثر نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا پر پڑا۔ ایک صنعتی پلانٹ کے مزدوروں نے پولیس ایکشن کے خلاف ہڑتال کی اور مذکورہ بالا اسکوائر پر جمع ہوئے' اجتماعی اجلاس کے آخر میں کسی نامعلوم شخص نے بم کا دھماکہ کر دیا۔ بہت سے لوگ اور آٹھ پولیس والے بھی مارے گئے۔ متعلقہ حکام نے اس پر تشدد مظاہرہ کا سارا الزام مزدوروں پر ڈال دیا اور آٹھ مزدور لیڈروں کو اس الزام میں گرفتار کر لیا جبکہ یہ الزام کسی طور بھی ثابت نہ ہو سکا تھا کہ یہ مزدور لیڈر بم سازش میں شریک تھے۔ ان میں سے سات کو موت کی سزا سنائی گئی اور آٹھویں کو قید کیا گیا۔ سات میں سے چار کو پھانسی دے دی گئی اور ایک نے خودکشی کو فوقیت دی اور بقیہ دو کی موت کی سزا قیدِ سخت میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ تین قیدی 1893ء میں ''الی نائیز'' کے گورنر جان آلٹ گیلڈ کے زمانے میں رہا کر دیئے گئے۔ مگر یہ تحریک یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ ان مزدوروں کے خون نے رنگ لانا شروع کیا اور 1889ء میں ورلڈ سوشلسٹ پارٹیز کانگریس نے ہیرس میں امریکہ کی مزدوروں کی تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے مزدوروں کے لئے آٹھ گھنٹے یومیہ کام کا مطالبہ کیا' انہوں نے یکم مئی 1890ء کا دن اپنی تحریک کے بھرپور مظاہرہ کے لئے منتخب کیا۔ اس کے بعد تو بہت سے ممالک میں یکم مئی مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جانا شروع ہو گیا۔ بڑے بڑے جلسے' مظاہرے اور سیمینار بلکہ محنت کشوں کی پریڈ کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ یہ دن امریکہ میں ستمبر کی تحریک کے مماثل بھی سمجھا جاتا ہے جب 1882ء میں اول اول آٹھ گھنٹے یومیہ کام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ حکومتوں اور مزدور تحریکوں نے متفقہ طور پر یکم مئی کو مزدوروں کے دن کے طور پر تسلیم کر لیا اور اس دن عام تعطیل ہونے لگی' اس دن دنیا کے مزدوروں کے سلسلے میں تقاریر اور دیگر تقاریب کا اہتمام ہونے لگا۔ اگرچہ یہ واقعہ تو شکاگو امریکہ میں وقوع پذیر ہوا تھا مگر بالشویک روس اور دنیا کے دیگر سوشلسٹ و کمیونسٹ ممالک میں اس کی بازگشت بڑی تیز آواز کے ساتھ سنی گئی اور اس دن کو بڑے شایانِ شان طریقے سے منایا جانے لگا۔ پاکستان میں بھٹو صاحب کے زمانے میں اس

دن کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور یہ ایک عام تعطیل کا دن تھا مگر اب مرکزی سرکاری حکومت کی طرف سے یہ تعطیل ختم کر دی گئی ہے۔

جہاں جہاں یکم مئی مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے اس کے مظاہروں سے ایک بات کا بڑے بیّن طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن محنت کشوں کا دن ہے جو فیکٹریوں' کارخانوں اور مِلوں میں جسمانی محنت ومشقت کا کام انجام دیتے ہیں' ان مظاہروں میں مزدوروں کی ٹریڈ فیڈریشنیں' مزدور انجمنیں اور عام جسمانی محنت کش بھرپور طریقے سے شرکت کرتے ہیں اور معاشرے میں بھی یہ بات حقیقتِ ثابتہ کی طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ یہ مزدوروں کا دن ہے اور مزدور وہی ہوتا ہے جو جسمانی محنت ومشقت کے کام انجام دیتا ہے۔ سوشلسٹ روس نے بھی جب مزدوروں کی اور کسانوں کی حکومت کا نعرہ دیا تو اپنے سرخ پرچم کے لئے درانتی اور ہتھوڑے کا نشان پسند کیا' گویا مزدور سے مراد کھیت مزدور اور فیکٹریوں میں جسمانی مشقت انجام دینے والے انسان تھے۔ اگر ہم کسی لغت کو اٹھا کر دیکھیں تو وہاں بھی یہ نکتہ کارفرما نظر آتا ہے کہ مزدور کے بنیادی معنی میں جسمانی محنت ومشقت بنیادی عنصر ہے۔ مزدور کا لفظ دراصل دو لفظوں کا مرکب ہے' مُزد + وَر جس کے معنی محنت مزدوری کا معاوضہ حاصل کرنے والا ہیں۔ فارسی لفظ مُزد کے معنی مزدوری' اجرت' طلبِ تنخواہ' صلہ اور بدلہ کے ہیں۔ اسی لئے مزدور کے معنی مزدوری کرنے والا یا اجرت پر کام کرنے والے کے ہیں۔ مزدوری کے معنی لغت میں کام کا معاوضہ' محنت کا صلہ' مشقت اور محنتانہ دیئے گئے ہیں جبکہ مزدوری کرنے کے معنی محنت مشقت کا کام کرنا ہیں۔

اس تمام بحث سے ہماری مراد یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں مزدور یا اس کا ہم معنی لفظ بولا جاتا ہے اس سے انسانوں کا وہ گروہ مراد ہے جو جسمانی محنت ومشقت انجام دیتا ہو' خواہ وہ زمین کو پھاوڑے اور گیتی سے کھودتا ہو' فیکٹری یا کارخانے میں کام کرتا ہو' کھیت مزدور ہو یا مشینوں پر انتہائی محنت ومشقت کے ساتھ خدمات انجام دیتا ہو۔ یورپ اور امریکہ میں ایسے لوگوں کے لئے ''نیلے کالر'' والوں کی اصطلاح عام ہے۔ جو لوگ دفاتر' مدارس یا دیگر تجارتی وعلمی کام انجام دیتے ہیں وہ الگ گروہ شمار ہوتے ہیں اور ''وہائٹ کالر'' والوں کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یکم مئی کے موقع پر جو ترانے اور گیت ریڈیو' ٹیلی ویژن سے نشر کئے جاتے ہیں وہ بھی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں ؎

مزدور کے ماتھے پر محنت کا پسینہ ہے ہر قطرہ ہے اک موتی' ہر موتی نگینہ ہے

گویا مزدور وہی ہے جو پسینہ بہا کر محنت ومشقت کی خدمات انجام دے رہا ہے اور اس گروہ میں وہ انسان ہرگز شامل نہیں ہیں جو حکیم' ڈاکٹر' اساتذہ یا سائنسدان وغیرہ ہیں۔

اس کے علاوہ ایک خیال آفرینی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ مزدوروں کا یہ طبقہ معاشرہ میں کمتر حیثیت کا حامل ہے جبکہ دوسرے طبقات اعلیٰ وارفع درجات رکھتے ہیں۔ یوں تو محنت کی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں' کہا جاتا ہے کہ حضورؐ اپنی

جوتیاں خود گانٹھ لیا کرتے تھے' جنگِ خندق میں عام مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور مزدور کی مزدوری اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنے کا حکم بھی آپؐ ہی کا ہے مگر ان تمام لن ترانیوں کے باوجود پرنالہ وہیں گرتا ہے کہ بندہ کوچہ گردی ہی کرتا رہتا ہے اور خواجہ بلند بام سے اترنے کا نام نہیں لیتا۔ مزدور کی حیثیت معاشرے میں ڈھکی چھپی نہیں' ہمارے ہاں کمی کمین کے الفاظ اس بات کی بھرپور غمازی کر رہے ہیں کہ ہاتھ سے کام کرنے والا کیا مقام رکھتا ہے' اس کے بیٹھنے کی جگہ کیا ہے' اسے دیگر لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے کن آداب کا خیال رکھنا ہوتا ہے' اس کے رشتے ناطے کن لوگوں سے ہو سکتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ اس کے خیال کی پرواز کیا ہونی چاہئے' بقول پرویزؔ صاحب کے کہ نماز تو محمود و ایاز ساتھ ہی مساوات کے ساتھ ادا کرتے ہیں مگر نماز کے بعد ایاز نے محمود کے جوتے اٹھائے اور پیچھے پیچھے چل پڑا' گویا ہر شخص کی ایک حیثیت مقرر ہے' آقا آقا ہے' مزدور مزدور ہے۔ بال جبریل میں علامہ اقبال نے لینن کی زبانی ''اللہ سے شکوہ'' کہلوایا ہے جس سے درج بالا کیفیات کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس بالِ جبریل میں علامہ فرماتے ہیں ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

بندہ و آقا کی یہ تفریق' محنت و مشقت کرنے والے اور دیگر امور انجام دینے والے گروہوں میں یہ زمین و آسمان کا بعد اور معاشرہ میں ہر اس شخص کو بری نظر سے دیکھنے کا رواج جو جسمانی محنت و مشقت کرتا ہو اور ہر اس شخص کی عزت کا تصور جو کم از کم محنت کرتا ہو بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ عزت اس کی ہوتی ہے جو کچھ نہ کرتا ہو بلکہ عیش کی کھاتا ہو۔ جاگیردار' خوانین' وڈیرے اور سرمایہ دار اگر کچھ نہ کرتے ہوں صرف حقہ گڑگڑاتے' اپنے کمی کمینوں پر احکامات صادر کرتے نظر آئیں تو ان کو حد درجہ قابل عزت' پرشکوہ اور قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اگر ان باتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے اور تجزیہ کیا جائے تو جو بات نکھر اور ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ محنت کرتے ہیں اور بعض لوگ نہیں کرتے اور معاشرہ نے ان گروہوں کی عزت و تکریم کے اپنے معیار بنا لئے ہیں۔ نیز یہ کلیتہً سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر شخص کے لئے محنت کرنا ضروری نہیں' جس قدر محنت سے دور ہوں گے اسی قدر لائق احترام۔ یہ سب انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے جس کی سزا مختلف گروہ بھگت رہے ہیں۔

اس ضمن میں اور اس موڑ پر فکر کا تقاضا ہے کہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم کیا رہنمائی کرتا ہے اور اس کی تعلیمات کیا ہیں' کیا وہ ان نظریات سے متفق ہے یا اس کی اپنی کوئی راہ ہے۔ محنت کے موضوع پر قرآن کریم کی 53 ویں سورت

النجم کی 39 ویں آیت ایک ایسی چمکتی ہوئی روشن راہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس سے تمام معاملہ بالکل صاف، نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور تمام اشکال حل ہو جاتے ہیں، ارشاد ہے :وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۝ (53:39) جس کے معنی ہیں کہ انسان کو اس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا جس کے لئے اس نے محنت نہ کی ہو، گویا وہ صرف محنت کے ماحصل ہی کا حقدار ہے گویا:

قرآنِ کریم کی رُو سے ہر انسان محنت کش ہے:

یہ آیۂ کریمہ تمام انسانی گروہ کا رتبہ، درجہ اور ان کی حیثیت متعین کر دیتی ہے اور معاشرہ کی اس تفریق کے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے جس نے محنت و مشقت کی بنیاد پر انسانوں کو گروہوں میں بانٹ رکھا تھا، ہر انسان پر ماسوا بچوں اور معذوروں کے محنت کا فریضہ از بس ضروری ہے اور وہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے جو دولت یا اثاثہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اسے محنت کرنی ہوگی، بغیر محنت کئے اس کا کسی چیز پر حق نہیں۔ جب معاشرہ میں ہر شخص محنت کا پابند ہوگا تو ہر شخص محنت کش ہوگا، ہر شخص ''مزدور'' ہوگا اور اس طرح یکساں عزت کا حقدار ہوگا۔ معاشرہ میں یقیناً درجات ہوں گے مگر وہ اختلاف افعال کی وجہ سے ہوں گے، لوگوں کا مختلف اشغال کی طرف مائل ہونا اور مختلف پیشے اختیار کرنا بھی اللہ کی رحمت ہے ورنہ مختلف امور کا انجام پانا اور لوگوں کے اذواق کا مختلف نہ ہونا معاشرہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ سورۃ الزخرف جو قرآن کریم کی 43 ویں سورت ہے اس کی آیت 32 ملاحظہ فرمائیے:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ (43:32)۔

(ترجمہ) کیا یہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں؟ ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

اب اگر محولہ بالا دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسان کا تعلق خواہ کسی گروہ سے ہو یعنی خواہ وہ جسمانی محنت و مشقت کرتا ہو چاہے اس کا ذریعہ آمدنی ذہنی کاوش ہو، ہر دو ذرائع میں محنت کا عنصر قدر مشترک ہوگا، اگر حصول زر کا کوئی ایسا ذریعہ تلاش کیا گیا ہے جس میں محنت موجود نہیں تو وہ اللہ کی نظر میں جائز نہیں اور ایسے ذریعہ سے اجتناب ضروری ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے جو ذرائع آمدنی اختیار کئے جاتے ہیں ان کو عمومی طور پر پانچ طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں۔

(1) عطیہ: کوئی شخص کسی کو کوئی چیز ہدیہ کر دے مگر اس میں لین دین کا معاملہ نہیں ہوتا۔

(2) اجرت: محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(3) ربو: دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے، سرمایہ دینے والا محنت نہیں

کرتا بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کرتا ہے۔

(4) منافع: تجارت میں حاصل ہوتا ہے جس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(5) قمار: قمار و میسرہ (جوئے) میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے عطیہ، اجرت اور منافع حلال جائز ہیں جبکہ ربوٰ اور قمار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ عطیہ میں تو چونکہ لین دین کا معاملہ ہوتا ہی نہیں اس لئے اس میں کسی قسم کی گفتگو کی زیادہ ضرورت نہیں البتہ جن دو چیزوں (اجرت اور منافع) کو جائز قرار دیا گیا ان میں محنت کا عنصر موجود ہے۔ اور جن دو چیزوں کو حرام قرار دیا گیا (ربوٰ اور قمار) ان میں محنت سرے سے موجود نہیں۔ گویا محنت ہی وہ رکنِ رکین ہے جو ذرائع آمدنی اور ہمارے نظامِ اقتصاد کی جڑ ہے، اصل و بنیاد ہے۔ اس موقع پر اگر اس بات کی بھی وضاحت کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ قرآنِ کریم کی رو سے جہاں ہر گروہ کے لئے محنت کا عنصر ضروری قرار دیا گیا ہے وہاں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ سورۃ النساء کی 32 ویں آیت میں واضح کر دیا گیا کہ:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (4:32)۔

(ترجمہ) اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے اور عورتوں کو ان کاموں کا اجر ہے جو انہوں نے کئے۔

ہم نے اوپر سورہ النجم کی 39 ویں آیت کا جو حوالہ دیا ہے وہی ہمارے نظامِ اقتصاد کا قبلہ بھی متعین کرتی ہے۔ ہمارے ماہرین اقتصادیات جن کو اصلاً بوجھ بجھکڑ کہنا چاہئے وہ عوام الناس کو شراکت اور مضاربت جیسی اصطلاحات سے مرعوب کر کے موجودہ سودی بنکاری نظام کو مشرف بہ اسلام کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں حالانکہ ان اصطلاحات کا تعلق دورِ کا بھی قرآن کریم سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً جن نظریات کا یہ پرچار کرتی ہیں وہ قرآن کریم کے نقیض ہیں، یہ اصطلاحات مسلمانوں کے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہیں۔ یہ ماہرین اقتصادیات ایک نکتہ بڑے فخر کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ اسلامی بنکاری میں منافع (سود) متعین نہیں ہوگا اور اس طرح یہ شیرِ مادر کی طرح حلال ہو جائے گا۔ یہ حضرات اگر ذرا سا اس بات پر غور کر لیتے کہ قرآن کریم نے سورہ بقرہ کی 275 ویں آیت میں اس بات کی تشریح کر دی ہے کہ تجارتی منافع اور ربوٰ (سود) ایک جیسے نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ربوٰ کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ تجارتی منافع کو حلال کیوں قرار دیا اور سود کو حرام کیوں قرار دیا گیا، یہ بات بالکل واضح ہے کہ تجارت میں سرمایہ ضرور لگایا جاتا ہے مگر اس میں محنت بھی کی جاتی ہے اور دراصل یہ منافع اسی محنت کا ہوتا ہے، ہمارے بزرگ ''آٹے میں نمک'' کی بات ایسے موقع پر اسی لئے کہتے تھے۔ اب تجارت میں سرمایہ کا منافع (سود) بھی شامل کر لیا گیا ہے اور محاورہ الٹ گیا ہے یعنی ''نمک میں آٹا'' منافع ہونے لگا ہے۔ رہی بات ربوٰ کی تو اس کو اس لئے حرام

قرار دیا گیا اور اسے تجارتی منافع کے غیر مماثل قرار دیا گیا کیونکہ اس میں محنت کا عنصر مفقود ہوتا ہے اور یہ سرمایہ پر بڑھوتری ہوتی ہے جو ناجائز ہے۔ احادیث و روایات میں ایسی امثال بکثرت موجود ہیں جو شراکت و مضاربت کی نفی کرتی ہیں۔ صحاح ستہ کی ایک روایت حضرت رافع بن خدیج ؓ سے مروی ہے کہ:

''میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور مہیر) سے سنا جبکہ وہ دونوں اپنے محلہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی ہے۔''

یہی راوی اپنے ماموں سے نقل کرتے ہیں۔

''میرے ماموں ایک دن آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی بات سے منع فرمادیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زیادہ نفع بخش تھی مگر اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری ہمارے اور تمہارے لئے کہیں زیادہ نفع بخش ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تہائی اور چوتھائی پر اور کرایہ پر زمینیں دینے سے بالکل منع فرمادیا ہے۔'' (کنز العمال)

جابر بن عبداللہ ؓ سے بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ: ''جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ زمین ہو اسے وہ خود ہی کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو بخش دے یا اپنی زمین کو یونہی پڑا رہنے دے۔''

ان احادیث و روایات سے بھی اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ ذرائع آمدنی کے لئے از خود محنت کی ضرورت ہے۔ دوسرے کی محنت پر آکاس بیل بن کر گزارہ کرنا حرامِ قطعی ہے اور ناجائز۔ محنت ہی وہ ذریعہ ہے، وہ عنصر ہے جو ہماری آمدنی کا واحد منبع و مخرج ہے اور اسی میں عظمت ہے۔ ہر شخص اپنا ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے چونکہ محنت پر مجبور ہے اس لئے ہر انسان از روئے قرآن کریم محنت کش ہے اور مزدور ہے خواہ وہ کسی قسم کی بھی محنت کرتا ہو، جسمانی یا دماغی۔ اسی نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے راقم الحروف علامہ اقبال کے وہ اشعار نقل کرتا ہے جو انہوں نے خضر سے سوال جواب کی صورت میں بیان کئے ہیں۔ خضر سے سوال کیا گیا:

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

خضر کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں

(مفہوم القرآن، سورۃ البقرہ، آیات 183 تا 188)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡكِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لیکن میدانِ جنگ میں ثبات و اِستقامت کا سوال ہو، یا معاشرتی اور معاشی دنیا میں نظامِ عدل ومساوات کا قیام، یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تمہیں اپنے آپ پر ضبط ہو۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ تمہارے کسی طبیعی (حیوانی) تقاضا اور بلند انسانی قدر میں ٹکراؤ ہو، تو تم اس قدر کو طبیعی تقاضا پر ترجیح دو۔ نیز تم جفاکشی اور مُشقت طلبی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو، اور زندگی کے سفر میں راستے کے خطرات سے محفوظ رہو۔ یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں (گنتی کا تعین، بجائے خویش، ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے)۔ پھر، جو کوئی تم میں سے مریض ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کر لے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں، لیکن اُس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اُس کے لئے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہئے کہ روزے کے عوض، کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے (اس سے، کم از کم، معذور اشخاص کا قلبی تعلق، اِس اجتماعی فریضہ کے ساتھ قائم رہے گا)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ قانونی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ تم روزہ بہ مشقت نباہ سکتے ہو۔ یہ چیز تمہارے اپنے فیصلہ کرنے کی ہے۔ لہٰذا اپنی حالت کا جائزہ تم خود لو۔ اگر تم دیکھو کہ صورت بَین بَین ہے، تو پھر تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے، خواہ اس میں (مقابلۃً) تھوڑی سی مشقت بھی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جو مقصد روزے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ اُس کے فدیہ سے نہیں ہو سکتا ___ بشرطیکہ تم روزے کی حکمت سے واقف ہو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝(2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی ___ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔

پھر سُن لو کہ روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اِس قابل ہو جاؤ کہ، خدا نے جو تمہیں راہ نمائی عطا کی ہے، اُس کے ذریعے تم قانونِ خداوندی کو ساری دنیا کے قوانین سے بلند کر سکو (9:33)۔ اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝(2:186)

نہ ہی روزوں کے حکم سے، تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ، مادی لذتوں اور جسمانی ضرورتوں کے ترک کر دینے سے اِنسان خدا کا مُقرب بن جاتا ہے (جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں، مختلف ریاضتوں اور مشقتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے)۔ (اے رسول ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو اُن سے کہہ دیں کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص، اپنی راہ نمائی کے لئے مجھے پکارتا ہے تو، میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اُس کے سامنے آجاتا ہے)۔ لہٰذا، اِن سے کہہ دو کہ قُربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56، 8:24، 16-32:15، 40:60، 42:26)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ دلائل وبراہین کی رُو سے، عقل وفکر کی روشنی میں، زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے چلتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال سے ہوگا (3:194)۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ (2:187)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی ــــ بیویوں سے جنسی اختلاط، ''قربِ خداوندی'' کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصوّر ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (57:27)۔ لہٰذا، خدا کا قانون، اس بارے میں، اِنسانوں کی خودساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، اُن سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم، رات کے وقت، منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنی بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو اور کھاپی بھی سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد، رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم، اِس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تاکہ تم اُلجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سُلجھا سکو، تو پھر تم اِن راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یک سوئی سے معاملاتِ پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔

بس یہ ہیں وہ حدود جو اِس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کردی ہیں۔ اِن کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام وقوانین کو نمایاں طور پر بیان کردیتا ہے تاکہ لوگ اِن کی پوری پوری نگہداشت کرسکیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (2:188)

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) روزے سے مقصد یہ ہے کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہوجائے کہ تم، زندگی کے ہر گوشے میں، جائز اور ناجائز میں تمیز کرسکو، اور، خواہ تمہاری مفاد پرستی کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) آپس میں ایک دوسرے کا مال، ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جاچکا ہے، تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

روزوں سے تمہاری اس قسم کی تربیتِ ذات مقصود ہے۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 6

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

آج موسم بڑا خوشگوار ہے۔ کلیم الزماں اور ان کا پورا خاندان صبح سویرے ناشتا کر رہا ہے۔ گرم گرم چائے کے ساتھ بہت کچھ کھانے کی میز پر رکھا ہوا ہے اور ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق ناشتہ کرنے میں مصروف ہے، اچانک جہاں آرا جو اپنے میکے میں آئی ہوئی ہیں بول اٹھتی ہیں۔

جہاں آرا: امی! آج تو حلیم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ بیٹی کی خواہش کا خیال کرتے ہوئے کلیم الزماں اپنی بیگم حلیمہ صاحبہ کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔

کلیم الزماں: بیگم صاحبہ! آج تو میری بیٹی نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے لیکن میری ایک درخواست ہے کہ حلیم پکاؤ تو اسم بامسمیٰ نہیں ہونا چاہیے۔ حلیمہ صاحبہ نے کلیم الزماں کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا کہ عقیل صاحب کو وہ چیز پسند نہیں جو آپ چاہتے ہیں۔ ذرا مرچیں زیادہ ہوئیں تو ان کا چہرہ اور مزاج مرچیلا ہو جاتا ہے۔

کلیم الزماں: عقیل کے لئے تھوڑا سا علیحدہ بنا لیجئے گا۔

عالم آرا: اگر حلیم میں مرچیں نہ ہوں تو وہ صرف دالوں کا ملغوبہ رہ جاتا ہے اور یہاں لاہور والوں کو تو حلیم پکانے اور کھانے کا سلیقہ ہی نہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! ہر جگہ ایک سی چیز نہیں ملتی۔ پشاور میں چپلی کباب بہترین ملتے ہیں۔ راولپنڈی کی باقر خانی مشہور ہے اور کراچی کی بریانی اور حلیم، اور حلیم بھی وہ جو کسی اچھے ہوٹل کی ہو۔ ورنہ عام دکاندار تو حلیم میں مرچوں کے علاوہ روئی بھی ڈال دیتے ہیں۔ حلیم دراصل دلی اور لکھنؤ کی پیداوار ہے اور یہاں لاہور کے تو گردے، کپورے، لسی اور مرغ چھولے مشہور ہیں۔ اس حلیم کا کہنا ہی کیا جو دلی کی شاہی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ملتی ہے۔ عام طور پر حلیم کو پتیلوں میں اور چولہوں پر بنایا جاتا ہے لیکن جو بازاروں میں دکان لگا کر حلیم بیچتے ہیں ان کے ہاں حلیم کو مٹکوں میں پکایا جاتا ہے جو زمین میں گڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا چولہا بھی زیرِ زمین ہوتا ہے۔ اس طرح کی حلیم کو کھانے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کلیم الزماں نے اپنے باورچی کو بلایا اور اسے حلیم تیار کرنے کے لئے ہدایات دیں کہ حلیم کے ساتھ سبز مرچ کٹی ہوئی، کالی مرچ، لیموں کٹے ہوئے، ادرک باریک کٹا ہوا اور پیاز کے لچھے گھی میں تلے ہوئے اور ساتھ دہی بھی، اور اعلان کر دیا کہ حلیم آج

نہیں کل ملے گی کیونکہ اسے ساری رات چولہے پر رہنا ہے۔ سب لوگوں نے ناشتہ کرلیا تھا اس لئے سب اٹھ گئے لیکن عالم آرا کلیم الزماں کے پاس ہی بیٹھی رہی اور کلیم الزماں سے کچھ پوچھنے والی تھی کہ انہوں نے کہا کہ تم مطالعہ کے کمرے میں چلو میں ذرا فارغ ہوکر آتا ہوں اور پھر فراغت کے بعد کلیم الزماں نے کہا بیٹی! تم کچھ پوچھنے والی تھیں۔

عالم آرا: جی ابو میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو روزانہ دیکھتی ہوں۔ آپکے معمولات کو دیکھتی ہوں، پھر معلوم نہیں آپ کو خیر کے پلڑے کی کیوں فکر ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! اگلے دن ٹی وی پر ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شاید حضور ﷺ سے یا کسی اور سے سنا کہ تمام بنی نوع جنت میں داخل ہوگی سوائے ایک فرد کے تو ان پر یہ خوف طاری ہوا کہ وہ فرد وہ خود تو نہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب ان پر نزع کا عالم طاری تھا تو انہوں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ کاش! عمر یہ تنکا ہوتا تاکہ اسے باز پرس اور جوابدہی کا خوف نہ ہوتا۔ اگر صحابہ کرام کا حال یہ ہو تو کلیم الزماں کس کھیت کی مولی ہے کہ ہر وقت جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور میں جانتا ہوں کہ وکیل کی حیثیت سے اور پھر جج کی حیثیت سے مجھ سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ میں اپنے موجودہ عمل سے تمہاری اور دوسرے اہل خانہ کی تربیت سے اپنی گذشتہ زندگی کی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ وہ دیکھو (دیوار پر لگے ہوئے کتبے کی طرف اشارہ کر کے) اس کتبے کا کیا مطلب ہے؟ ''ان الحسنات یذھبن السیآت''۔ مطلب ہے کہ نیکیاں گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔

عالم آرا: ابو! آپ کے متعلق تو مشہور ہے کہ وکیل کی حیثیت سے آپ اپنے ہم پیشہ لوگوں میں قابلیت کی بناء پر بڑے سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے اور جج کی حیثیت سے بھی آپ کے فیصلے دوسرے وکلاء اور جج حضرات کے لئے قابل ستائش ہیں جن سے وہ لوگ راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! یہ دو اور دو چار کی طرح نہایت آسان سوال ہے جس سے ناواقفیت کی وجہ سے لوگ وکلاء حضرات کو معاشرے کی کریم سمجھتے ہیں۔ ایسے وکلاء بھی ہیں جنہیں ہم معاشرے کی کریم کہنے پر حق بجانب ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے ورنہ ان کی اکثریت تو یوکریم ہی ہے۔ ہمارے ایک ملنے والے صاحب تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ نام ان کا تھا مرزا اسلم بیگ۔ مفلسی کے باوجود بڑی محنت سے وکالت تک پہنچے۔ تھوڑی مدت تک وکالت کی۔ ایک دن ایک غم زدہ خاتون ان کے پاس آئی۔ شاید کوئی خاندانی جھگڑا تھا میاں بیوی کے درمیان۔ فیس کے طور پر خاتون نے اپنا زیور اتار کر آنسو بھری آنکھوں سے دینا چاہا۔ مرزا صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ اس کا مقدمہ بغیر فیس کے لڑا اور پھر قانون کی جو دو چار کتابیں ان کے پاس تھیں ان پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی اور پھر ساری عمر مختلف کمپنیوں میں لیگل ایڈوائزر کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے۔ بیٹی! ایسے لوگ بھی ہیں لیکن آٹے میں نمک کی طرح۔

عالم آرا: ابو! یہ دو اور دو چار والی آسان بات کی وضاحت کریں۔

کلیم الزماں: فرض کیا کہ عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مدعی کوئی دعویٰ کرتا ہے اور مدعا علیہ اس دعویٰ کا جواب دیتا ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ میں ایک حق پر ہے اور دوسرا ناحق پر۔ دونوں کے وکلاء دلائل دیتے ہیں۔ اگر ناحق والے کا وکیل

زیادہ ہوشیار ہے تو وہ اپنی چرب زبانی سے فیصلہ اپنے موکل کے حق میں کرالیگا۔لیکن وکالت تو اس کا پیشہ ہے اور اسی سے اس نے اپنی روزی بھی کمانی ہے اور اپنا مقام بھی بنانا ہے۔تھوڑی ہی مدت کے بعد اس کا ضمیر مردہ ہوجائیگا اور حالت یہ ہوجائے گی کہ ؎

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ناحق کو حق ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا اور جب اس کی شہرت لب بام پہنچے گی تو حکومت اسے عدالت کی کرسی پیش کرے گی اور وہ ایک ہی جست میں چور سے قطب ہوجائے گا اور یہ بھی نہ بھولو کہ صرف چرب زبانی ہی کام آتی ہے۔وکیل اور جج کے درمیان اور بھی رابطے ہوتے ہیں جن کی مدعی اور مدعا علیہ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ساری عمر عدالت میں خود جھوٹ بول کر اور موکل سے جھوٹ بلوا کر ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہ سکتی ہے؟ہاں اگر کوئی شعیب آئے میسر تو شبانی سے کلیمی دو قدم ہے اور میری خوش قسمتی کہ مجھے علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویز کی صورت میں دو شعیب میسر آ گئے اور نخل سینا پر برق پاشی ہوگئی۔

عالم آرا: ابو! میں آپ سے آج ایک دو اشعار کا مطلب سمجھنا چاہتی ہوں۔

کلیم الزماں: بیٹی! کبھی تمہاری امی کی حلیم مجھے آف ٹریک کر دیتی ہے اور کبھی تمہارے سوالات۔میں چاہتا ہوں کہ سورہ خاشیہ کے وہ احکام تمہیں سمجھا دوں تا کہ تم ان لوگوں کے کام آسکو جن کا ذکر سورۃ نازعات کی پہلی آیت میں زیر بحث آچکا ہے۔پہلے ہم بادلوں پر گفتگو کرتے ہیں کیونکہ انہی کے ذریعہ سے ہمیں وہ پانی ملتا ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔پہلے بھی ان کا ذکر آچکا ہے لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی۔زمین پر جاندار مخلوق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ پانی ہے اور ایسا پانی جو جاندار مخلوق کے لئے ممد حیات ہو، وہ صرف بادلوں ہی سے حاصل ہوتا ہے۔جو کبھی دریاؤں کے ذریعہ سے اور کبھی زیر زمین ذخائر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ہمارے ملک میں آبپاشی کے سارے نظام کا انحصار بادلوں پر ہے۔بادلوں سے برسنے والے پانی ہی سے ہمارے ڈیم بھرتے ہیں جو آبپاشی کے ساتھ ساتھ پن بجلی اور پن چکیوں کے نظام کو توانائی بخشتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی ضرورت کے ساتھ اس کی جمالیاتی حس کا بھی خیال رکھا ہے۔تم نے مشہور انگریزی شاعر کیٹس (Keats) کا مصرعہ سنا ہوگا۔

My heart Leaps up when I see a Rainbow in the sky.

اور پھر جب ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو تو اسی سے محظوظ ہوتے ہوئے کتنا لطف آتا ہے (مسکراتے ہوئے) اور جب کبھی تم ایسے موسم میں عقیل میاں کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی ہو تو کتنا لطف آتا ہوگا۔کلیم الزماں کی طرف دیکھ کر عالم آرا زیر لب مسکراتی ہے جس میں حیا کا پہلو غالب ہے اور کلیم الزماں عالم آرا کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔میں بھی کبھی حلیمہ بیگم صاحبہ کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جایا کرتا تھا لیکن یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا۔

عالم آرا: ابو! میں سوچتی ہوں کہ کالج میں اگر آپ میرے استاد ہوتے تو میری شخصیت کچھ اور ہوتی۔آپکا بات کو سمجھانے کا انداز بہت خوبصورت ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! جب تم خود اپنے سکول کی پرنسپل ہوگی تو انشاء اللہ سورۃ نازعات کا غنچہ گل صد برگ بن کر تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جس کی تم تمنا کر رہی ہو۔ہاں تو بات بادلوں کی ہو رہی تھی۔مشرق میں تو بس بادل کو بادل کہہ دیا یا زیادہ سے

زیادہ گھٹا یا کالی گھٹا، مغرب کے علمائے موسمیات نے بادلوں کی کئی اقسام گنوائی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح کسی علاقے کی آب وہوا اور روزانہ بدلتے ہوئے موسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی علم کی بنا پر وہ موسم کی تبدیلی کی پیش گوئی کر دیتے ہیں اور آجکل یہ پیش گوئیاں ہوائی سفر کے لئے کتنی مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہواؤں کے چلنے کا علم بھی منسلک ہے کیونکہ بادل ہواؤں کے دوش پر ہی سوار ہو کر اپنا سفر کرتے ہیں۔ جسے علم موسمیات کہتے ہیں۔ اس کے دائرے میں کئی علوم آجاتے ہیں اور موسمیات پر ہی کیا منحصر ہے علوم بالحواس کی دنیا اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلاں علم ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ہر علم دوسرے علوم کے ساتھ کچھ نہ کچھ رابطہ ضرور رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ پہاڑوں کو دیکھو ان کے لئے نصب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مجھے پہاڑوں کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں۔

Internal Combustion انجن کے اوپر ایک چھوٹا سا آلہ لگا ہوتا ہے۔ جسے گورنر کہتے ہیں وہ انجن کی رفتار کو باقاعدہ رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زمین کی محوری اور مداری گردش کو کنٹرول کرنے میں پہاڑوں کا کچھ کردار ہو کیونکہ ماہرین فلکیات کے علم کے مطابق زمین کی گردشوں میں کھڑکھڑے لٹو کی سی بے قاعدگی موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑ پانی کو برف بنا کر پانی کے ذخائر کا کام کرتے ہیں جو سارا سال ندی نالوں اور دریاؤں میں بتدریج بہتا رہتا ہے۔ پہاڑ ہواؤں اور ان کے ساتھ بادلوں کا رخ بھی متعین کرتے ہیں۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو شاید دریائے سندھ اور گنگا کی وادیاں بھی نہ ہوتیں۔

علامہ اقبال نے ہمالیہ پہاڑ کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

لیکن مسلمان چشم بینا کہاں سے لائے، مغرب کے دلیر مجاہد چاند پر پہنچ گئے اور یہ ابھی تک یہ کہہ رہے ہیں۔

گھٹا سے چاند آرہا ہے باہر وہ رخ سے گیسو ہٹا رہے ہیں نکھر رہا ہے تمام عالم فضا میں جلوے سما رہے ہیں

ملا کی دوڑ مسجد تک ہے ورنہ قرآن مجید کہتا ہے کہ سرخ وسفید اور کالی پیلی چٹانوں کو دیکھو، ان میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں بے شمار قسم کے قیمتی پتھر اور کئی قسم کی معدنیات موجود ہیں لیکن ہم نے تحقیق کرنا اپنے لئے حرام سمجھا ہوا ہے۔ الغرض یہ موضوع ایسا ہے جس پر تحقیق جاری ہے اور علم الجبال کے ماہر نہ معلوم مستقبل میں کیسے حقائق واشگاف کریں گے۔ اسکے بعد ہم سماء کو لیتے ہیں۔ ''سماء'' کا مطلب پوری کائنات بھی ہوسکتا ہے۔ فضائی کرّوں کے لئے بھی سماء کا لفظ استعمال ہوا ہے اور فضا کے لئے بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ چیزیں بھی آسمان کی طرف دیکھنے سے نیلی نظر آتی ہیں اور جس میں رات کے وقت ستارے چمکتے ہیں۔ اس علم کو فلکیات کہا جاتا ہے یا علم الافلاک۔ قریبی سماء کی گہرائی چودہ میل بتائی جاتی ہے۔ جس کی مدد سے سورج کی روشنی زمین تک پہنچتی ہے۔ انسان کی طبیعت میں جستجو کے عنصر نے اسے چاند تک تو رسائی دے دی ہے اور اب وہ مریخ پر کمند ڈال رہا ہے۔ سائنسدانوں کا بھیجا ہوا روبوٹ مریخ پر اتر چکا ہے۔ دیکھیں وہ کس قسم کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جستجو کے اسی جذبہ کو سراہتے ہوئے علامہ نے کہا تھا۔

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی درماں نیافریدی آزار جستجو را

(ترجمہ: خوش ہوں کہ عاشقوں کو تو نے ہمیشہ کے لئے سوز بخش دیا (لیکن) جستجو کے آزار کا کوئی علاج تو نے

پیدا نہیں کیا۔)

علم افلاک ایک وسیع علم ہے اس کو حاصل کرتے ہوئے اور اس کے مختلف مظاہر پر تحقیق کرتے ہوئے علمائے فلکیات کی عمریں گزر گئی ہیں لیکن اس علم کی تشنگی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اسی طرح سورج ہے جو زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کی روشنی اور حرارت زندگی کے لئے پانی کے بعد ضروری اور اہم ہے کیونکہ پانی کی موجودگی کے باوجود اگر سورج کی روشنی اور حرارت نہ ہو تو زندگی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ پنپ سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی سورج کی اس اہمیت کے پیش نظر بانگ درا میں ایک نظم ''آفتاب'' کے نام سے کہی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔ ویسے پوری نظم مطالعہ کے لئے انسان میں روشن ضمیری پیدا کرنے کے لئے بڑی اہم ہے۔

اے آفتاب روح و روان جہاں ہے تو شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

یہاں چوتھے مصرع میں لفظ ''سبز'' سے علامہ کا اشارہ غالباً کلوروفل ایفیکٹ کی طرف ہے۔

عالم آرا: یہ کلوروفل ایفیکٹ کیا ہوتا ہے؟

کلیم الزماں: بیٹی! اس کی علمی حیثیت سے تو میں واقف نہیں کیونکہ یہ مسئلہ خالصتاً سائنسی ہے۔ اتنا ضرور مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر پودوں کو روشنی نہ ملے تو وہ زرد ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد مرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اچھا تو اس کے بعد ہم زمین کی طرف آتے ہیں۔ زمین کے متعلق علم رکھنا انسان کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس علم کی ضرورت کے باوجود مشہور ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ دونوں ہیں بے حیا۔ ادھر یاد کرا اور ادھر بھول جا۔ (باپ بیٹی دونوں ہنستے ہیں)۔ جغرافیہ کیا ہے اپنے ماحول سے واقفیت اور اگر اس واقفیت کو علمی سطح پر حاصل کیا جائے تو یہی علم جغرافیہ بن جاتا ہے۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ انسان کی یا دوسری جاندار اشیاء کی زندگی کا انحصار انہی اشیاء پر ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف علوم کا حصول ضروری ہے۔ اسی کو تسخیر کائنات کہا جاتا ہے جسکی تاکید قرآن مجید نے کی ہے۔ انسان کی یہی خصوصیت کہ وہ اپنے ماحول سے واقفیت حاصل کر کے اس کو تسخیر کرنے اور اس سے حسب منشاء فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے جو اسے انسان بناتی ہے اور ماحول سے مراد ارض وسماء مافیھا ہے۔ علم الارض کو جغرافیہ کہا جاتا ہے۔ اسکی کئی شاخیں ہیں مثلاً طبعی جغرافیہ، سیاسی جغرافیہ، اقتصادی جغرافیہ۔ پولیٹیکل جغرافیہ کی مثال یہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے دوران ایک جغرافیہ دان مسٹر الائیڈ نے پیش گوئی کی تھی کہ جنگ ختم ہوتے ہی یورپ میں ایک نیا ملک وجود میں آئے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جنگ ختم ہوتے ہی چیکوسلوواکیہ نے جنم لیا۔ ایک امریکی جغرافیہ دان مسٹر کیمپل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ، "امریکہ نے جہاں بھی کوئی جنگ ہاری ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سپاہی اس علاقے کے جغرافیہ سے ناواقف تھے جہاں وہ جنگ کے لئے بھیجے گئے تھے"۔ اقتصادی جغرافیہ اسے کہتے ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ کس علاقے کی پیداوار کیا ہے، اسے انسان اپنے لئے کیسے استعمال

کرسکتا ہے اور اس کی تجارت کس انداز سے ہوسکتی ہے۔ طبعی جغرافیہ کی مثالیں تو دی جا چکی ہیں۔ اس کے لئے ایک عظیم علم طبقات الارض ہے جس کے ذریعہ زمین کے اندر موجود اشیاء کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اسی علم کے ساتھ زلزلوں کا علم وابستہ ہے۔ یہ تمام علوم جو گنوائے گئے ہیں مرئی اشیاء کے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ غیر مرئی اشیاء یا قوی کا علم ہے جس کے انکشاف کا سہرا برصغیر کے ایک بنگالی سائنسدان جگدیش چندر بھوس کے سر ہے۔ اس نے فضا میں موجود ریڈیائی لہروں کا انکشاف کیا اور یہ ثابت کیا کہ پودوں میں بھی زندگی موجود ہے اور وہ بھی کسی عمل کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ریڈیو کے موجد مارکونی نے جگدیش چندر بھوس کی ہدایت کے بعد ریڈیو کی ایجاد کی۔ اسی علم کی بدولت کمپیوٹر ایجاد ہوا۔ اسی علم نے انسان کو چاند تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دی اور آج اسی علم کی بدولت ہر گھر میں ٹیلی ویژن موجود ہے۔ ہر جیب میں موبائل ٹیلی فون بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انہی علوم کو قرآن مجید علم کہتا ہے اور ان کے حصول کے بعد انسان انسان بنتا ہے ورنہ اس کی حیثیت جانوروں کی طرح ہوتی ہے کہ، پیدا ہوتا ہے، زندگی بھر کھاتا پیتا ہے، اولاد پیدا کرتا ہے، جاگتا سوتا ہے اور آخر ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی زندگی کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

عالم آرا: ابو! آپ نے بڑی اچھی معلومات فراہم کی ہیں لیکن آپ کی تقریر میں قرآن وحدیث یعنی قرآنی علوم کا کوئی ذکر نہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! قرآنی علم کو ہم علم الاخلاق کہیں گے۔ علم الاخلاق کا وظیفہ کیا ہے یہی کہ طبعی علوم کے حصول سے جو فوائد حاصل ہونگے انہیں کیسے استعمال کیا جائیگا۔ اگر طبعی علم حاصل نہ کیا جائے تو علم الاخلاق ایک کھوکھلا علم رہ جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے طبعی علوم سیکھنے کی تاکید کی ہے۔ علامہ اقبال طبعی علوم کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

علم اسما اعتبار آدم است حکمت اشیاء حصار آدم است

عالم آرا: ابو! آپ نے تو مجھے بھی نخل سینا بنا دیا۔

کلیم الزماں: بیٹی! ابھی منزل دور ہے۔ آپکا نخل سینا اس وقت بارآور ہوگا جب ہمارے بچے فارغ التحصیل ہوکر عملی زندگی کا آغاز کریں گے۔ سکول کا نام ہوگا ''نخل سینا سکول'' یہ ایک تحریک ہوگی۔ میرے ذہن میں ہے کہ اسی سکیم کے تحت پرائمری اور سکینڈری سکول بھی کھولے جائیں گے۔ کالج اور یونیورسٹی کے لیول تک جانا ہوگا اور یہ ساری عالم آرائی، عالم آرا کے ہاتھوں ہوگی۔ میری تمنا ہے کہ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کی طرح بارآور ہو اور ہمارے سکول کا ہر بچہ شہزادرائے یا ابرار الحق بن جائے۔ بیٹی! جاؤ اب آرام کرو یہ باتیں تو جب تک زندگی ہے چلتی ہی رہیں گی۔

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

15 دسمبر 1968 کو بتقریب جشنِ نزولِ قرآن ۔ عید الفطر

خصوصی درس قرآن کریم

آسمان سے رزق:

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ' لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت جو بار بار آئے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے' اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جاں نثار حواریوں نے' آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ''مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ'' اتارے تاکہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ: رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (5:114)۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان ''آسمان'' سے عطا فرما تاکہ وہ رزق' اس جماعت کے السابقون الاولون کے لئے بھی موجبِ جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔۔ تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔'' سوال یہ ہے کہ یہ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے اترنے والا رزق۔۔ کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔ اعجوبہ پسندوں نے تو حسب معمول' اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانے کا طشت اترا کرتا تھا حتیٰ کہ اس میں جو کھانے اترتے تھے ان کی تفاصیل تک بھی دینے لگ گئے۔ لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں' وہ جانتے ہیں کہ جماعت مومنین جب ''آسمان سے رزق'' طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خودساختہ نظام کی رو سے ملتا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسم انسانی کی نشوونما کے ساتھ' شرف وتکریم انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد آں خدا نانے دہد جانے دہد

(مفہوم: یہ خدا (لوگوں کو) روٹی دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں جان نکال لیتے ہیں۔ جبکہ وہ حقیقی خدا (قرآن کی

تعلیمات کے ذریعے) رزق، روٹی بھی دیتا ہے اور زندگی (کی خوشگواریاں بھی عطا کرتا ہے۔)

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ ''ان تاکل منھا و تطمئن قلوبنا'' وہ ہمارے لئے وجہ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینان قلب بھی۔ مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہوسکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو۔۔ اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینان قلب اسی زندگی میں حاصل ہوسکتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق بسر ہو۔۔۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (13:28)۔ یہی تھا وہ رزق جسے وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ (5:114)۔ کہا گیا تھا۔ یعنی خدا کے نظام ربوبیت کی صداقت کی نشانی اور اس کے خیر الرازقین ہونے کا ثبوت۔۔۔ یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (5:115)۔ جو اس نظام رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کرے گا' جو اسے دوسروں سے چھپا کر رکھے گا' اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس کفران کا نتیجہ:

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ:

خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔ اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفر برتا اور نظام خداوندی کی جگہ اپنا خود ساختہ نظام اختیار کرلیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔ (16:112)۔

ایسینی فرقہ:

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور انکے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو ان کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خود ساختہ نظام ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آجاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظام معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہون منت ہوئے بغیر' سامان زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشن عید بنتا تھا۔ لیکن وادیٔ قمران سے حال ہی میں جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں ان سے اس جماعت کے احوال وظروف پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو اس زمانے میں ایسینی فرقہ کے نام سے معروف تھی اور جو حضرت یحییٰ کے زیر تربیت وقیادت پروان چڑھی تھی۔ خود حضرت عیسیٰؑ بھی' اپنے زمانۂ نبوت سے قبل اسی جماعت سے متعلق تھے۔ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے فاضل نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد' آپ کے

متبعین کی جو جماعت بیت المقدس میں آ کر جمع ہوئی تھی خود اس کے متعلق بھی، موجودہ انجیل میں لکھا ہے کہ:

وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر) خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔ (رسولوں کے اعمال۔ 27-2:21)

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (سماوی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشن عید منایا گیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی مخالفت:

اور یہ صرف حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ خدا کا ہر رسول اسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں ''تیری اور میری'' کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا امت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاع زیست ہو۔ کیا آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قبیلہ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد، سارا سامان رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں۔ یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں، مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو الٰہ تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدت خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدت انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساوات انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے، مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ ''اللہ ایک ہے'' کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی۔ انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں اور ''تمام انسان ایک جیسے ہیں'' کے نظریہ کا اولین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامان زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر اس طرح سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دست نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلاف کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو کہ ؎

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلماںؓ مزدکی است

(مفہوم: اس کی نگاہ میں بالا اور پست، اونچا اور نیچ برابر ہیں۔ وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخواں پر، مل کر کھانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح کی مساوات اور بھائی چارہ عجمی ہیں۔ (عربی اصولوں کے خلاف ہیں) میں

خوب جانتا ہوں کہ یہ سلمان فارسیؓ ''مزدکی'' ہے)

مساواتِ انسانیہ کا اصول:

یہ تھا وہ نظام، جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے متمول طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔ قوم مدین نے حضرت شعیبؑ کی نماز (صلوٰۃ) کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ، انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ نظام خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام، دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساوات انسانیہ قائم رہتی ہے۔ مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا، دونوں، ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنا دیا ہے۔ دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی یکساں ہوتی ہیں۔ یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہے مساوات انسانیہ کی بنیاد۔ لیکن انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام، ان میں تفریق پیدا کر دیتا ہے۔۔ ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں جتنا دوسرے انسان کے کتوں کو ملتا ہے۔ دین خداوندی اس تفریق کو مٹا کر، مساوات انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت:

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف ''روٹی'' (بنیادی ضروریات زندگی) پر نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ارتقائے حیات کی موجودہ سطح پر، انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی توحید کا اولین مرکز قائم کرتے ہیں۔۔۔ تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے، یہی ہے کہ: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:126)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پرامن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر دے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، رزق فراواں کو خدا کا انعام، اور بھوک کا اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔۔ (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (7:40)۔ ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلان عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح

کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھالیا۔'' یہ کیا ہے؟ وہ عدم مساوات انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آ گئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہوجاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھالیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں' یہ اسلامی نظام نہیں کہلاسکتا۔ اس لئے اس بستی پر سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہوجاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریہ زندگی' وہ نظام حیات' وہ تہذیب' وہ تمدن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے' جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ' اسی نظام' اسی تمدن کے لئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعث منفعت ہو۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط (13:17)۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجہ کشش اور باعث طمانیت و تسکین نہیں ہوسکتا۔۔ کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جاکر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھایئے' وہ انہیں کبھی (Appreciate) نہیں کرسکے گا۔ اسے بتایئے کہ ملک میں بجلی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سربفلک عمارات کھڑی ہوگئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پرفشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں سبک خرام ہیں۔ وہ یہ سن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن۔۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔۔ بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف' سعدی کے الفاظ میں' بھوکے کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم۔۔ صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی۔۔ اس سے بھی آگے بڑھئے جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنوحنفیہ نے آٹے کا ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس خدا کو بھی کھا گئے۔ اور ایک قبیلہ بنوحنفیہ ہی پر کیا منحصر ہے' ہر بھوکا اس خدا کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔ روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس خدا کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے۔۔ لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں' جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں' جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں' جس کے پاس دم توڑنے والے بچے کے حلق میں ٹپکانے کے لئے دودھ کے چار قطرے نہیں' اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجہ سکون اور باعث دلکشی نہیں ہوسکتی۔ جس شخص کے پاس اپنے بچے کے داخلہ کے لئے پیسے نہیں' اس کے لئے یہ خوش خبری کس طرح وجہ طمانیت ہو سکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہوگئے ہیں۔۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اسمیں ہر ایک فرد کو کیا میسر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہوگیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے۔۔ جنت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامان آسائش و آرائش ہے' ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ جس جنت میں مساوات انسانیہ نہیں' وہ جنت نہیں جہنم ہے۔

صرف خدا کی ملکیت:

لیکن اس قسم کی عملی مساوات انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں' افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین' اس کے چشمے' اس کی نہریں' اس کے باغات' افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعہ اراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے' اسے گرو رکھ دے یا فروخت کردے۔ توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلۂ کائنات کا واحد مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیت میں کسی اور کو شامل کرلیا جائے تو یہ شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن اندادا من دون اللہ کہہ کر پکارتا ہے (2:22)۔ جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کرلی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو' وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہوجاتے ہیں اور محتاجی کا اگلا قدم۔۔ یا یوں کہئے کہ فطری نتیجہ۔۔ محکومی ہے۔ قرآن' اس تصور کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو' جن کے تابع فرمان رہتے ہو' وہ وسائل رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ ۔۔ رزق' خدا کے ہاں سے طلب کو۔ وَاعۡبُدُوۡہُ۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ وَاشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ (29:17)۔ اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہوگی۔ تم اپنے غلط نظام معیشت کی وجہ سے' دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم ان کے محتاج و محکوم بھی ہوجاتے ہو اور رہین منت اور سپاس گزار بھی۔ اس طرح تم اپنی شرف انسانیت کو بیچ کر' اپنے بدن کو زندہ رکھتے ہو۔ قرآن' اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال وطیب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ: فَکُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّاشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114)۔ اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہوکر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال وطیب کہا جائے گا۔ یعنی مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو۔ یہی تھا وہ حلال وطیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشن عید منایا گیا تھا اور یہی تھا وہ رزق طیب جو اس رسول ﷺ آخرالزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثت عظمیٰ کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَیُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (7:157) وہ نوع انسان کے لئے رزق طیب کو حلال قرار دے گا اور رزق خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال و سلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور محتاجی ومحکومی کی استخواں شکن سلوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جو رزق نظام خداوندی کے تابع ملتا ہے' اسے قرآن نے ہر جگہ ''رزق کریم'' کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خودساختہ نظام کی رو سے بھی مل ہی جاتا ہے' لیکن وہ رزق ملتا ہے عزت اور توقیر بیچ کر۔ لیکن

خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترام انسانیت بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ رزق ''رزق کریم'' ہوتا ہے۔

انسانیت کش نظام:

دین خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہو سکتی ہیں جب وہ سامان زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشوونما پا گئیں تو وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں، انسانی سطح پر کبھی نہ آ سکیں۔ آپ سوچئے کہ جب انسانوں کی اکثریت کو اس طرح ابھرنے اور آگے بڑھنے سے روک دیا جائے تو یہ چیز ارتقائے انسانیت کے راستے میں کس قدر سنگ گراں بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اکتناز دولت کرنے والے سرمایہ داروں اور ان کے شریک کار مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا ہے کہ وہ کاروان انسانیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (9:34)۔

رسول ﷺ کے بعد:

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے، اسے قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انکے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تاکہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ (انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا۔۔۔ خود قرآن کریم میں، اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے اس مقام پر کہا کہ اس طرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا، ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے۔۔ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور

لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنالیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا دیا کرو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطہ خداوندی کو بتمامہٖ لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہوگا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہوگا کہ تمہیں پچاس فیصد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85) تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظام خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوشیوں پر زد پڑتی ہو، پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ان کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دین خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی، اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا بڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔ اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ روایات اور حکایات وضع کی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(1) قرآن کریم میں ہے:

دولت جمع کرنے کے خلاف:

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے، ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔ جس دن چاندی سونے کے ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔ (35-9:34)

ان آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے

خلاف کیا کیا۔اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔وہ روایت یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔پس عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی ﷺ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔الخ

(ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، جلد اوّل، اردو ترجمہ ص:309)

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ۔

(1) صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔

(2) صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔لیکن وہ حکم ان پر سخت گراں گزرتا ہے۔وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتا ہے۔

(3) رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔(واضح رہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)۔

آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دیدینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

عبوری دور کے احکام:

ایک مثال اور لیجئے۔قرآن کریم کا نصب العین ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی، بطور بنیادی حق انسانیت ملتی رہیں۔آغاز اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے، بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ظاہر ہے کہ اس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت

موجود تھا۔۔ کچھ لوگ امیر تھے، کچھ غریب اور محتاج۔۔ اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)۔ اے رسول ﷺ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظام مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ، خیرات، فطرانہ کے لئے صبح و شام، دن رات، ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے، کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت، زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے۔ (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ:

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظام معاشرہ ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم، فلہٰذا، دوسروں کا محتاج رہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو۔ یہ دوسرا طبقہ، پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے، جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا حصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے، نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکے دے کر، جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ، قرآن کے الفاظ میں، ان لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ، اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی سخت تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقة تميت القلب (خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔)

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے ماتحت دیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی امداد کے بعد اسے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ و خیرات کو مستقل کار ثواب قرار دے کر، قوم میں

محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا تا کہ ثواب دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظام معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

نظامِ ربوٰ:

ایک مثال اور سامنے لایئے۔ قرآنی تصور معیشت کی رو سے' کوئی شخص جو کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزء ہتیا کر لے جائے' وہ چور ہے' ڈاکو ہے' رہزن ہے' فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظام معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰ کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔۔ ربوٰ کے معنی ہیں بڑھوتری۔ یعنی اپنے سرمایہ سے زیادہ وصول کرنا۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ ۚ (2:279)۔ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رو سے ربوٰ کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰ کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰ کی تعریف (Definition) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیر مادر کی طرح حلال وطیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰ ہے اور بس۔ یعنی زمیندار کا' کاشتکار کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ لینا ربوٰ نہیں۔ صاحب جائداد کا مکانوں کا کرایہ وصول کرنا ربوٰ نہیں۔ ایک کارخانہ دار کا ہزارہا مزدوروں کی محنت کے ماحصل میں سے انہیں تین چار روپیہ روزانہ دے کر باقی سارا غصب کر لینا ربوٰ نہیں۔ دکاندار کا' کاریگر کو کم از کم اجرت دے کر' باقی سارا منافع ہڑپ کر جانا' ربوٰ نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت نے ربوٰ کی غلط (Definition) سے' (ایک مختصر سی شکل کو چھوڑ کر) ربوٰ کے سارے کاروبار کو کس طرح حلال وطیب قرار دے دیا۔

تجارت کا منافع:

اسی سلسلہ میں' ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے لاگت پر کچھ زیادہ وصول کر لینے کو تجارت قرار دے کر' اس منافع کو جائز قرار دیا تھا۔ یہ درحقیقت' اس چیز کے فروخت کرنے والے کی محنت کا معاوضہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تجارت جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ جو قافلہ ترکستان سے سامان لاد کر' پہاڑوں' دریاؤں' صحراؤں' جنگلوں' پرخطر راستوں' برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا' مہینوں کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا' وہ جو کچھ اپنے مال پر زائد وصول کرتا تھا' وہ اس کی محنت کا معاوضہ تھا۔ اسے قرآن نے ربوٰ کی حد سے خارج قرار دیا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص' ایک کمرہ میں میز کے سامنے بیٹھا ٹیلیفون پر سودے پر

سودے کرتا چلا جاتا ہے۔ نہ حقیقتاً کچھ خریدتا ہے نہ بیچتا اور اس طرح شام کو ہزاروں روپے اس کے بینک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے تجارت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہزاروں روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ان اشیاء کے صارفین کی جیب سے۔ کیا یہ صارفین کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو غصب کر لینے کے مرادف' فلہٰذا ربوٰ نہیں؟ لیکن مذہبی پیشوائیت کا نظام اسے ربوٰ قرار نہیں دیتا۔۔ وہ' دوسروں کی محنت غصب کر لینے کے ان تمام طریقوں کو حلال وطیب قرار دیتا ہے اور اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں' تو ان زمینداروں' کارخانہ داروں' اور اس قسم کے منافع خور سوداگروں سے اپیل کرتا ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر' اپنا گھر جنت میں الاٹ کرالیں یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوالیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ (2:85) ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسول ﷺ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔ غلط نظام کی عدالت' چور' ڈاکو' رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں' اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام' روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بنائیں گے' لیکن ربوٰ کی ان دوسری شکلوں میں' سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے۔۔ ہے ناں یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) کی بین مثال!

بھوکے کا جرم:

اس کے برعکس' اگر کسی مزدور کو مسلسل کوشش کے باوجود روزگار نہ ملے اور بھوک سے تنگ آ کر کہیں سے روٹی چرا لے تو قانون اسے جیل خانے بھیج دیتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ بھی ہماری تاریخ میں موجود ہے کہ جب ایک شخص کے ملازموں (غلاموں) نے بھوک سے تنگ آ کر غلہ چرایا تھا' تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا نہیں دی تھی۔ سزا ان کے مالک کو دی تھی' یہ کہہ کر کہ اگر تم انہیں بھوکا نہ رکھتے تو یہ چوری کرنے پر مجبور کیوں ہوتے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ درحقیقت قرآن کریم کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اضطراری حالت میں بقدر ضرورت حرام شے کا کھا لینا بھی جائز ہے۔ امام ابن حزم نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

فقہا کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص پیاسا ہے اور اس کی وجہ سے اسے موت کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو اس کے لئے فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی پانی پائے' لے لے۔ خواہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس پر اضافہ کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

اگر پیاس کی وجہ سے موت کی مدافعت کے لئے پانی حاصل کرنے کی خاطر جنگ کرنے کی اجازت ہے تو کیا وجہ ہے کہ بھوک اور عریانی کی وجہ سے حفاظت جان کے لئے جنگ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق کرنا قرآن' سنت' اجماع اور فقہی قانون قیاس کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امام ابن حزم کہتے ہیں کہ:

اگر اس مقابلہ میں یہ مجبور شخص مارا جائے تو فریق مخالف کے ذمے اس کی دیت لازم آ جائے گی۔ لیکن اگر وہ شخص مارا

جائے جو اس کے حق کو روک رہا تھا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس کا حق روکا تھا۔ (المحلیٰ، جلد:6)

معاشرہ میں اس قسم کی صورت حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ:

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔۔ باب الفتن)

آپ دیکھئے، کہ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اوپر والے پانی نہیں دیتے تو نیچے والوں کو چاہئے کہ صبر شکر کر کے بیٹھ جائیں اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ حضور ﷺ ایسا فرما ہی نہیں سکتے تھی کوئی ایسا شخص اس قسم کی بات نہیں کہے گا جسے معلوم ہو کہ جان کی حفاظت، ہر جاندار کی زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس تقاضا کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اسی تقاضا کا اعتراف تھا جس کے لئے خدا نے بھوک سے مجبور و مضطر کے لئے حرام کھا لینے کی اجازت دی تھی۔ قرآن کریم کے اسی حقیقت بدوش فیصلہ کی تعمیل تھی جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کو سزا نہیں دی تھی۔ اسی قرآنی فیصلہ کی عملی تشریح تھی جس کے لئے امام ابن حزم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بھوکے، پیاسے، ننگے کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے جنگ تک بھی کرنی پڑے تو اسے معذور سمجھا جائے گا۔۔۔ اور اسی صورت حال کو روکنے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کشتی اسی صورت میں سلامت رہ سکتی ہے جب تمام اہل کشتی کو ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے۔

یہ تھا خدا کا فیصلہ اور یہ تھی اس فیصلے کی عملی تشریح جو اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی۔ لیکن اب یہ فیصلہ سمٹ سمٹا کر صرف اتنا رہ گیا کہ بھوکے کے لئے، اضطراری حالت میں سؤر کا گوشت کھانا جائز ہے۔۔ یعنی جس بھوکے کے پاس روٹی کھانے کے لئے چار آنے کے پیسے نہیں، وہ کہیں سے تلاش کر کے، دس روپے کا لحم خنزیر حاصل کرے تو اس سے اپنی بھوک مٹا سکتا ہے۔۔ آپ نے دیکھا کہ اس فتویٰ کی رو سے کس طرح قرآن کا حکم بھی (بظاہر) اپنے مقام پر باقی رہا اور ''کشتی'' کے اوپر کے حصے والے'' بھی دندناتے پھرتے رہے! لیکن اس قسم کی خود فریبی یا ابلہ فریبی سے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق، کشتی تو سلامت نہیں رہ سکتی۔

ظواہر پرستی:

دین کے نظام میں، نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہونا تھا۔ یعنی مساواتِ انسانیہ اور

احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز، روزہ وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، اس کے قانون مکافاتِ عمل کے لئے حیات آخرت پر، ملائکہ پر، ضابطہ خداوندی پر اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابط خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب وجوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو، یا ان میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے، یا وہ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔ نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے۔۔ الخ (2:177)

ایمان کی اہمیت:

اس مقام پر میں، ایک ثانیہ کے لئے رک کر، ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان، درحقیقت وہ آئیڈیالوجی، وہ نظریہ ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا، اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمال انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی، کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسانی عمل کا جذبہ محرکہ ہی اس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدار حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (Values) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو محض آب وگل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام، تو انسانی زندگی، حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام، جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہو سکتا تھا، پروان نہیں چڑھ رہا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن، ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریہ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام، نظریہ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو، اس کی عمر، شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام، اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ۔۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ (3:144) یعنی، اور تو اور، خود محمد ﷺ بھی بجز ایں

نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں' یا وفات پا جائیں' تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا' پھر اپنے نظام کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ اور اس کی تشریح خلفیہ رسول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمد ﷺ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہئے کہ اس کا معبود حیی و قیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلان عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لیجا کر اقدار و نظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات و تصورات کو اختیار کر لیا' اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع و اعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ' نسل' زبان' وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر' ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں' میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدت امت اس صورت میں وجود پذیر ہو سکتی ہے جب اس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دہرا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدت امت کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی' ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک' رسول ایک' قبلہ ایک' کلمہ ایک ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر۔۔ ایک قوم کے افراد ہیں۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف' ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں۔ اس خود فریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ' ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں' اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر' تشکیل قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں'۔۔ مثلاً نسل' یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔۔ انہیں' نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلاف اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوام عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قومی اور اجتماعی نہیں۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اب بھی قوم نہیں بن سکے' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیش نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دہرا کر اس فریب نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کر دے گی۔

☆☆☆☆

اب پھر اسی مقام کی طرف آیئے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ' ارکان اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیات آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خودتراشیدہ تصور مذہب کی رو سے کچھ ہی سمجھ لو) میزان خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے' اسے بلا تامل و توقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیار خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں (9:19-20)۔

مساوات کے نمونے:

یہی وہ نظام تھا جس میں' کوئی فرد معاشرہ تو ایک طرف' (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مرجاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساوات انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا کوئی کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پر تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افراد معاشرہ کا معیار زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

مساوات سے مقصود:

آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مساوات ایسی نہیں تھی جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً' اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی' اور غریب آدمی' ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے۔ لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ' یہی سی کلاس قیدی' اس اے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن ان میں سے

وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مساوات انسانیہ سے مراد، جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھر کے افراد میں ہوتی ہے۔ اس میں، گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضروریات کے بقدر ملتا جاتا ہے۔ ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے۔ معیار زندگی کا نہیں۔ یہی کیفیت قرآنی نظام میں افراد معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس میں، قوم کے سارے بچوں کو ابنائے ملت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد، ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کر دی جاتی ہے۔ ہر فرد اس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے، اور نظام معاشرہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے۔ اس میں معیار زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے، لیکن انفرادی ذوق و رپسند کا میدان وسیع ہوتا ہے۔۔ یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص و تمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہر ذاتی، بلندی سیرت و کردار اور حسن کارکردگی کے مطابق۔ اور ضروریات زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسن ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش۔ جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے، معاشرہ کا معیار زیست بلند ہوتا چلا جائے۔ یہ ہے نقشہ قرآنی نظام معاشرہ میں مساوات انسانیہ کا۔ یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان۔۔ صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔۔ کا تعین کیا گیا تھا۔ ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے، اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے۔ اس کی روح اور حقیقت غائب ہے۔ اب بھی ہماری مسجدوں میں ''محمود و ایاز'' ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی۔۔ بلکہ اس صف سے اٹھنے کے بعد، صحن مسجد میں ہی ء۔۔ محمود، محمود ہوتا ہے اور ایاز، ایاز۔۔ عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر اور غریب سب ایک بن سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد، امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے، غریب بیچارا اس کا تصور مرنے کے بعد کی جنت میں ہی کر سکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے۔ روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ اسلامی مساوات ہے۔ لیکن وہ اس فرق کو کبھی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے۔ امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہو جاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اجتماع عید کا منظر:

اس رسمی اور رویتی مساوات کا بھانڈا بالآخر، عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے۔ جس انداز سے عید کے چاند کا انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق و شوق اور جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے، اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشن مسرت ہے لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جایئے، تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتے دکھائی دیتی ہیں کہ ''بابا! خدا کے نام پر۔۔ چار پیسے دیتے جایئے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔'' ''میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جایئے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں۔'' دوسری طرف

سے یہ دلگداز اور جگر خراش صدا وجۂ سوہان روح بنتی ہے کہ ''بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جایئے۔ خدا تمہاری نماز، روزے قبول کرے گا۔'' یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عیدگاہ میں داخل ہوں، تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقوں کے مارے ہوئے زرد زرد چہرے۔ افلاس وغربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے، افسردہ پیشانیاں، پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط۔۔ اس سے پہلے، پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم از کم سال میں ایک بار، عید کے موقعہ پر، نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھی اب آپ عیدگاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالئے۔ شاید ایک فیصد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہوگا۔ اور ان میں بھی اکثر ایسے جنکے کپڑوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہوں۔۔ ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ ادھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں۔۔ اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیر خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح ان کی نگاہ کبھی اس باطل نظام کی طرف اٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیر خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشن عید، جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے، وہ جشن، جشن نہیں۔ قوم کی بدنصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰ ؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فرد معاشرہ، بلا منت غیرے، بطور استحقاق، برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خودساختہ نظام کے تابع رزق ملے۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افراد معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف وتکریم انسانیت بیچ کر ملے۔۔ اس قوم کی عید، ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال، اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے، اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اسی (عید کی) نماز کے لئے امام نے بتایا تھا کہ اس میں چھ زائد تکبیریں ہوتی ہیں۔ تکبیر کے معنی ہیں۔۔ اللہ اکبر کا اعلان۔۔ مذہب میں چھ چھوڑ کر، چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہئے تو اس کا، دو لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے، نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں کائنات میں اقتدار اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے اور اس کا منقطی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر واصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم۔۔ سوچئے کہ اس تکبیر میں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے۔۔ مردار خور کرگسوں کا نہیں! والسلام

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآن مجید

پر پیشگی ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸ (10:58-57)

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی، زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

راشد جمعۃ الوداع کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو اس نے اپنی امی سے کہا:

''امی جان! آج مولوی صاحب اپنے خطبہ میں بار بار پڑھتے تھے: الوداع! اے ماہ رمضان الوداع! اور ساتھ روتے جاتے تھے۔ وہ روتے کیوں تھے؟''

اس کی امی نے کہا:

''بیٹا! رمضان کا مہینہ بڑا خیر اور برکت کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس کے چلے جانے کا غم ہوتا ہے اس لئے لوگ روتے ہیں۔''

راشد نے کہا:

''امی جان! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب رمضان شریف کا مہینہ وداع ہونے لگتا ہے تو لوگ روتے ہیں اور جب وہ وداع ہو جاتا ہے تو پھر عید مناتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

راشد کی امی نے مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور راشد سے کہا:

''شام کو تمہارے ابا آئیں گے تو یہ بات ان سے پوچھ لینا۔''

رات کے کھانے کے بعد راشد نے اپنے ابا سے وہی سوال کیا تو انہوں نے کہا: ''بیٹا! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ عید کیا ہے اور اسے کیوں منایا جاتا ہے؟ جب تم یہ بات سمجھ لو گے تو تمہارے سوال کا جواب خود بخود سامنے آجائے گا۔ لو اب غور سے سنو!

تمہیں معلوم ہے دنیا کی ہر قوم نے سال میں کچھ دن ایسے مقرر کر رکھے ہیں جنہیں وہ قوم اپنے تیوہار کی حیثیت سے مناتی ہے۔ کرسمس، عیسائیوں کا تیوہار ہے۔ ہولی ہندوؤں کا تہوار ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان کے خدا نے ایک دن تجویز کیا اور کہا کہ اس میں وہ خوشیاں منایا کریں۔''

یہ سن کر راشد چونک اٹھا اور پوچھا:

''ابا جان! کیا ہمارے لئے خود خدا نے تیوہار مقرر کیا؟ جس تیوہار کو خدا نے مقرر کیا ہو وہ تو بہت بڑا تیوہار ہوا؟''

''ہاں بیٹا! اس تیوہار کے بڑا ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے؟'' راشد کے ابا نے کہا۔

''تو ابا جان! مجھے بتائیے کہ اس تیوہار کی اہمیت کیا ہے؟ راشد نے پوچھا۔

اس کے ابا نے کہا: ''تم ذرا سوچو کہ اگر ایک شخص بچپن سے اندھا ہو گیا ہو۔ ہزار علاج معالجہ کے باوجود اس کی آنکھوں میں بینائی نہ آئی ہو۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا ہو لیکن ایک دن اسے ایسا سرمہ مل جائے جس سے اس کی بینائی واپس

آجائے۔اس کی آنکھیں روشن ہوجائیں۔وہ سب کچھ دیکھنے لگ جائے تو کیا یہ دن اس کی زندگی میں یادرکھنے کے قابل نہیں ہوگا؟ کیا وہ ہمیشہ اس دن کی یادنہیں منائے گا؟''

''ضرورمنائے گا؟'' راشد نے کہا:

اس کے ابا نے کہا:

''اسلام سے پہلے دنیا میں کہیں خدا کی وحی کی روشنی باقی نہیں رہی تھی۔ساری دنیا میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔انسان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے۔انہیں صحیح راستہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل کیا جس سے ساری دنیا میں روشنی پھیل گئی۔انسانوں کو صحیح راستہ واضح نظر آنے لگ گیا۔وہ اندھے تھے، انہیں آنکھیں مل گئیں۔تم ہی بتاؤ راشد بیٹا! یہ دن انسانوں کے لئے یادگار منانے کا تھا یا نہیں؟''

''ضرور تھا۔ابا جان!'' راشد نے کہا۔''یہی ہے وہ تیوہار جسے خدا نے تجویز کیا ہے۔'' راشد کے ابا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:''خدا نے کہا ہے کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ہے۔یعنی اس میں قرآن نازل ہونے کی ابتداء ہوئی ہے اور اس کے بعد خدا نے کہا ہے کہ تمہیں چاہئے کہ تم اس پر خوشیاں مناؤ۔لہٰذا! یہ تیوہار رمضان شریف کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔یوں سمجھو کہ یہ سارا مہینہ ہی خوشیاں منانے کا ہے۔یہ جشن مسرت کا مہینہ ہے اور اس جشن کی انتہا عید کہلاتی ہے۔''''میں اب سمجھا کہ جب عید کے متعلق لکھا ہوتا ہے کہ یہ جشن نزول قرآن ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' راشد نے کہا۔اس کے بعد اس نے پوچھا:''ابا جان! جب بات یہ ہے تو پھر مولوی صاحب جمعۃ الوداع کو روتے کیوں تھے؟''

''بیٹا! میرے خیال میں رونے کی کوئی وجہ تو نہیں ہے۔۔۔اچھا تم جاؤ اور اسکول کا کام کرکے سوجاؤ۔''

راشد اپنے ابا کو سلام کرکے اپنے کمرے میں چلا گیا۔اس نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ عید کی چھٹیوں کے بعد جب اسکول جائے گا تو وہاں لڑکوں کو بتائے گا کہ عید کیوں منائی جاتی ہے؟

سانحہ ارتحال

خواجہ ضیاء اللہ قدیمی رُکن بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور گذشتہ دنوں وفات پاگئے ہیں۔مرغوم کچھ عرصہ سے فالج کے حملہ کے بعد علیل تھے۔دعا ہے کہ مرحوم کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا کرے۔ادارہ مرحوم کے پس ماندگان اور اعزہ اقرباء کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔افسوس کے لئے مرحوم کے بیٹے سعد صاحب کا رابطہ نمبر ذیل میں درج ہے۔

رابطہ نمبر:0300-46514227

راجن پور سے عبدالرشید لنگاہ صاحب گذشتہ دنوں وفات پاگئے ہیں۔مرحوم قدیمی محبّانِ قرآن میں سے تھے اور فکرِ قرآنی کی توسیع واشاعت میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔دُعا ہے کہ اللہ کریم مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ادارہ مرحوم کے پس ماندگان اور اعزہ واقرباء کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 7

By G. A. Parwez (Episode No.1)
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is February 26, 1982 and today's lecture starts with verse (47:34) of Surah Muhammad (محمّد).

If you remember, the previous verses that we covered in the last lecture dealt with the struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل). This struggle has been going on throughout human history and will continue until eternity. Iqbal expresses this Quranic reality thus:

This perpetual struggle has always existed
Amid Muhammad's light and Abi Lahab's fire

The Quran recognizes only two groups, only two nations, only two parties in the world – one that accepts the Quran as *the* guidance for humanity and believes in Prophet Muhammad (PBUH) as His last Messenger; and the other which does not. By the way I could mention here that this principle of the Quran was the basis of our two-nation theory and hence the demand for Pakistan. The other group was opposed to this principle. The opposition forces form the other group. It does not mean that this opposition group necessarily fights in the battlefield. It means also that this group does not accept this principle as true, and it openly challenges this truth and engages in transgression against this principle.

If you remember, in many of these lectures, I had mentioned that one does not necessarily become a مومن (*Momin*) by being born in a Muslim family. One has to act upon the requirements to be a مومن (*Momin*). The Quran asks Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنزَلَ مِن قَبْلُ (4:136) – O you who profess to believe! Hold fast unto your belief in Allah, His Messengers, the Book which He has sent to this Messenger, and those which He had sent earlier. This has to be done practically in order to be part of the first group. Every child by birth is neither مومن (*Momin*) nor کافر (*Kafir*). The child is born as a human being. Later he needs to choose one of this two ways by his own freewill with full acceptance of his heart and mind. The Quran uses verb for these two ways: whether one *acts* as believer (**آمنو**), or whether one *acts* as a disbeliever (**کفرو**).

We saw in the last lecture what it means by obeying Allah and obeying the Messenger: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – O who you

claim to believe! You must follow and obey the Divine System that the Messengers has established, in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. However, Abul Kalam Azad propagated a Brahmo Samaji version of Islam. He said that, anyone (belonging to any religion) who leads a virtuous life and worships God then the goal of Islam is achieved. The question is: what is virtuous life? In Hindu religion it is individual charity, e.g., keeping some salt and water for animals is a virtue. But this is not true in Islam. Islam requires Iman first. Doing individual worship and doing individual charity is not what Islam is about?

Life has a serious purpose

To have Iman in Allah is a positive action. In reality, it is a change in mindset. It is this foundation what we call Iman on which the structure of دین (*Deen*) – the way of Divine life – is erected. It is fountainhead of willpower; it is the goal that determines the destination; it is the kernel of life's decision making ability. It is the essence of Iman around which life revolves. Everything that is done according to it is a virtuous action. Anything that is against it is bad and evil. So, it requires obedience to the divine laws – now contained in the Quran – that takes humanity to the proper destination. This is where the دین (*Deen*) wants to take us. This is the path on which are our Prophet's shining steps to guide us. This is the path that takes us to the correct destination. This is called Islam. Contrary to this, religion takes us away from the path of دین (*Deen*) and all efforts go to waste: حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (2:217). Obviously, if one takes a wrong turn and continues then one gets further and further away from destination and one's efforts get wasted. Journey without destination is vagrancy. This is the way of religion. Every religion, on its own, thinks that it is doing pious work on individual basis. This is not what Islam teaches. Islam is a collective system that requires collective obedience of Divine Laws contained only in the Quran and nowhere else.

The difference between Quranic society and secular society

My dear friends, what we call secularism, it is a system in which people just don't talk the talk but also walk the talk, spend time and effort, and get tired – but the result of this is not what takes humanity to the proper destination. Therefore: وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. Please notice here that this is not something to be done individually. This is a system of life whose obedience is to be done in order that the caravan of life reaches its destination. Contrary to this: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّـهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ اللَّـهُ لَهُمْ (47:34) – If those who deny the Divine Laws and obstruct others from adopting the Divine Order do not change their ways and die while continuing doing so, they will never be protected from the adverse consequences of their erroneous deeds. Therefore, if one is not punished in this world, it does not mean that he is saved from retribution. The consequences of one's deeds have to be faced after death. The first group (described earlier in verse 47:33) is traveling to the correct destination – but the second group not only does not accept that destination but even put roadblocks in the path of the

first group. And thus these second group commits two crimes: First, they themselves are not traveling to the correct destination and second, they are putting roadblocks in the path of those who are traveling to the correct destination.

The religious and spiritual roadblocks in the path of Quranic society

My dear friends, the Quran clearly identifies who are the people who put roadblocks in the path of Allah: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – O Believers! A good many of the spiritual leaders and religious priests devour others' property and turn them away from Allah's path. There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. For both are tidings of grievous chastisement. On the Day of Reckoning, the gold and silver will be heated in the fire of Jahannam and their foreheads, sides and backs will be branded therewith, and it will be said to them: "This is what you had treasured up for your exclusive use and deprived the needy of it. Taste then your treasures which you had amassed."

Regarding the religious and spiritual leaders the Quran clearly says that they thrive on other people's wealth and do not work themselves. This is their first crime. The next thing the Quran mentions above is about capitalists. What is a capitalist? The Quran defines them as people thrive on other people's hard work just by investing money. Among the capitalists the biggest group is these religious and spiritual leaders because they thrive on other people's effort without investing even a penny. Therefore, there is no risk at all unlike those capitalists who invest money. What could be more profitable business than this my friends? Not only that the very people who provide them sustenance also plead with them to accept their offerings; serve them with all their with their heart and soul; listen calmly to their angry words and keep pleading to them in prayers, and so on and so forth…

Our credulity to believe religious and spiritual scholars in spite of Quran's warning

Whenever religious scholars explain any Quranic verse, they start with what is called "Shaan-e Nuzul" or reason for its revelation. Then they start telling that such and such verse is about Jews; that such and such verse is about Christians; that such and such verse is about the Mushriks of Quraysh etc. When questioned: Well, is there anything about us too? Yes, of course, there is they tell us: Jannah is for us. But the Quran is addressing Muslims: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – O Muslims believers! A good many of your spiritual leaders and religious priests devour people's wealth and turn them away from Allah's path. And: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (9:34) – There are others who hoard gold and silver and do not keep it open for use in the way of Allah. O Prophet (PBUH) announce: فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) – For both are tidings of grievous chastisement. And: فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (47:34) – they will never be protected from the adverse consequences of their erroneous deeds.

The struggle between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) had been going on throughout human history. Every page of the Quran reflects the story of this struggle in one form or the other describing the many challenges that happen in the course of this struggle. The Prophet (PBUH) and the مُؤْمِنِين (*Momineen*) had to deal with more or less eighty two battles in Medina during the ten years of the Prophet's life. Then the Quran tells the مُؤْمِنِين (*Momineen*) to remain steadfast in the ongoing battle: فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Now that war with these opponents is imminent, do not be disheartened and do not minimize your struggle (because of activities of the hypocrites); nor call for peace by considering yourself weaker and subdued. Rest assured that you shall overcome them due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

A golden rule in battlefield

The Quran ordered the مُؤْمِنِين (*Momineen*): if the enemy surrenders during a battle – even though you may have the upper hand and about to win – then accept the overture of peace. Do not presume that the enemy is tricking you although that may be the case. Regardless, you give the benefit of doubt and accept the surrender. If it turns out that this was a trick then be always prepared to fight back. This is a message for humanity's benefit. If they were honest in making peace and you killed them thinking they were tricking you then this will be a crime against humanity. On the other hand, you do not make peace overture to an enemy because the enemy will exploit you and think that you are weak. This will create inflection in their hearts and they will take advantage of you.

The Quranic order will never let مُؤْمِنِين (*Momineen*) down

Quran states: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (47:35) – Rest assured that ultimately you shall dominate them; that you will be victorious. هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (48:28) – This is because Allah has sent his Messenger with the Divine Code, which is a system based on absolute truth. It can thus overcome all other manmade systems. This can only happen if the مُؤْمِنِين (*Momineen*) become powerful and strong enough to wipe out the false systems based on injustice and establish the Divine Order instead. وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (3:139) – O party of مُؤْمِنِين (*Momineen*)! Do not lose heart nor be depressed for you shall surely dominate, provided you are true believers. My dear friends, please note that this is being told about مُؤْمِنِين (*Momineen*) not us, born Muslims, because as we saw Allah is asking us also to acquire Iman! Considering oneself as **مومن** (*Momin*) by being born in a Muslim family is a great delusion. The Quran puts the condition of being مُؤْمِنِين (*Momineen*) as those over whom the unbelievers will never have domination.

A great lesson from a prisoner in the court of 'Umar (R)

We have the illusion that we are مُؤْمِنِين (*Momineen*) but every group in the world dominates over us whereas Allah says that no one can dominate مُؤْمِنِين (*Momineen*) because وَاللَّهُ مَعَكُمْ — Allah is with them. What it means that Allah is with the مُؤْمِنِين

(*Momineen*), my friends? If you remember I often repeat the story of Harmuzan (the Iranian governor) who was brought back to Medina as prisoner of war after Iran was defeated during Khalifa Omar's caliphate. Omar (R) asked him: Before, you used to dismiss Arabs and you even felt beneath your dignity to fight them. So, what happened this time? What was the reason that Iran lost the war and its ruler was running around seeking shelter and was killed by a water wheel under which he was hiding? Harmuzan replied: When we fought the Arabs before, there were Arabs one side and the Iranians on the other side. It was not difficult for us to defeat the Arabs. But now the Arabs and their God are on one side and we Iranians are on the other side. What to say Iran even the whole world cannot defeat them. My dear friends, Harmuzan knew what it means: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ – That Allah is with you.

Allah is with those who chart their destination of life according to the Quran and proceed fearlessly towards it. In fact, Allah says: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) – He is with you wherever you happen to be. Since Allah is everywhere so why the emphasis especially in the fight between THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل)? Because: وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ (47:35) – Be assured that you shall dominate because Allah is with you. Since your caravan is proceeding on the most balanced and straight path – الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ – under the guidance of Allah, so, He is with you. Because you have synchronized your will with the Will of Allah: وَاللّٰـهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (47:35) – Rest assured that you shall overcome forces of FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) due to the support and assistance provided by Divine Laws. He shall never reduce the consequences of your efforts. He will never let you down.

So, we have this group that has only the material interests as its goal. There is no higher goal in front of it. The Quran says that this kind of life is a life at the animal level. This is the life of secularism; this is the life of Kufr. This group enjoys material things, indulges in comforts of life, and dies. The other group thinks that material things are only the means to achieve a higher goal. And that higher goal is the establishment of دین (*Deen*) in this world that will place the caravan of humanity on the road that has been set by Allah. In secular life one is always afraid of death. Even a lowly ant fights obstacles in its path in order to survive. Preservation of self is demand of inner life. Life wants its protection. This is fundamental thing, and up until this point, the life of Momin and the life of Kufr share this common part. But, then comes the difference between the two lives.

Difference in the concept of life of Momin and Kafir

Yes, it is important to preserve the physical life by all means. But death is not the end of life. Death only destroys the physical life. However, a Momin is one who gives his physical life for the sake of THE TRUTH (*Al-Haq* - الحق) during fight between TRUTH (*Al-Haq* - الحق) and FALSEHOOD (*Baatil* - باطل) in order to achieve eternal life. The Quran says that Kafir is afraid of death but, you O Momin, embrace death for the sake of *Al-Haq* (الحق). Do you see my friends, the extremely contrasting

difference between the two mindsets? The Quran told this in few words. The Quran opens the door for a Mujahedin to achieve eternal life. History cannot provide any similar examples of the miraculous victories that were achieved in battles during the Prophet's life and the rightly-guided Khalifas. Allah's Mujahedin fight for the establishment of the system of universal sustenance that fulfils people's needs including that of Mujahedin's family. But the Kafirs fight for material wealth and power under auspices of capitalists who exploit them. And they are always afraid of death because they worry about what will happen to their families if they die. The mujahedin, on the other hand, fight with their heart and soul with conviction that death will open the door for eternal life, and therefore they are not afraid of death. The Quran offers glowing tribute to them: إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۚ وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ (47:36) – Also remember that your aim should not be gains of this worldly life. You should keep your attentions focused on the sublime and permanent values of life. Worldly life and its gains are nothing more than a mere play and passing amusement. If you have firm faith in this reality, and in conflict between worldly gains and any permanent value if you guard the permanent value, then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return. Therefore, at this juncture, you should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. All this will be returned manifold to you.

Also, the Quran demands يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ (47:33). That means it is not a question of believing once but believing at every step of life at every moment. If we take a step towards the destination then after every step we get closer to the destination. Therefore we must protect ourselves – وَتَتَّقُوا (47:36) by taking the proper turn at each crossroad under the eternal guidance of divine laws. If at any crossroad the traveler takes a wrong turn then each step takes him further away from the destination. So, the divine guidance will tell the traveler that you have taken a wrong turn and he immediately returns to the crossroad from where he took the wrong turn. This is called **توبہ** (*Tauba*).

So, **توبہ** (*Tauba*) is an action, not reciting the words, "O Allah **توبہ** (*Tauba*)". It is going back to where one took the wrong turn. This is called **تابہ** (*Taaba*). But just returning there is not enough. After returning there one has to move forward towards the destination. This is called **اصلح** (*Asla'ha*). In the Quran **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) always come together. If there is no time for **اصلح** (*Asla'ha*) then **تابہ** (*Taaba*) is meaningless. If you keep doing **تابہ** (*Taaba*) and **اصلح** (*Asla'ha*) then the Quran says your efforts will keep on producing good result. يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ (47:36) –Then the Divine Law of Requital will grant you full reward for your efforts without asking for anything in return.

Next the Quran reminds Muslims: وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (47:36) – Remember that at this juncture, the Prophet is trying to establish the divine order; he is trying to establish the divine government. In order to do this funds will be needed. Therefore, you should contribute whatever you can for the establishment of Divine Order. This

contribution of yours will be considered as the best loan (**قرض حسنہ**) that you give to Allah. This will be returned manifolds to you. This is like sowing one grain which produces seven hundreds grains. This will not be interest but the result of hard work.

The issue is very clear: every new system that is formed requires resources. Initially, the resources are spent in establishing the infrastructure and welfare institutions for the people. When this is done the system generates so much wealth and resources that it will be many times more, beyond your expectations; beyond your calculations; even beyond your comprehension. And the succeeding events in the life of Prophet (PBUH) and rightly-guided Khalifas proved that it did happen beyond human calculations. During Khalifa's 'Umar (R) rule the Islamic state expanded exponentially to more than two million square miles and the material resources increased beyond expectation so much so that even Khalifa 'Umar was surprised from the total tax revenue collected by Governor Abu Hurairah from his province.

Next the Quran says: إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ (47:37) – If the Divine Order demands something from you in order to establish itself, you might be hesitant to part with your material possessions. If such demands kept forthcoming, then you would niggardly cling to them, out of sheer disgust, and so, you may say whatever is concealed in your heart. Unlike other manmade systems, keep in mind that this divine order will not adopt such a course of action as whatever it demands is for your own benefit. Hence give to it willingly.

The law of succession and substitution of nations

My dear friends, we now come to the last verse of Surah Muhammad (محمّد). For the second time we have come to the 26th Parah (**جز**) of the Quran. The Quran describes the law of rise, fall, and demise of nations again and again. It describes how the substitution of one nation occurs with another nation. Apart from natural disasters that totally destroy smaller nations, the Quran also describes how a nation enslaves another nation; how a nation destroys another nation and takes over.

Listen my dear friends, how the Quran addresses the مُؤْمِنِين (*Momineen*): هَا أَنتُمْ هَـٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47:38) – But some amongst you act miserly when asked to keep their wealth open for the Divine Order. They should know that the one who is miserly in this matter in fact harms none but himself, for Allah is indeed magnificent. Allah does not need you to give Him anything. It is for your growth that you need His system. Should you turn back from your commitment, He will replace you with another nation which will not be like you! This is so because the law for life, death and supremacy amongst nations is that only the nation with the correct system of life survives. Those nations which have a wrong system are destroyed and replaced by another nation that has a better system. The decisions about life and death of nations are taken in light of their ideologies and practical implementation of their program.

To be continued

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امورِ دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کررہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرکے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی ونبوت کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
05

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآن مجید

پر پیشگی ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ (10:58-57)

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی' زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔